Regd. L. No. 7243 Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1970

قوموں کی تعمیر

فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں

تفصیل اندر ملاحظہ فرمایئے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان

سالانہ ـــــ دس روپے

ہندوستان

سالانہ ـــــ پندرہ روپے

غیر ممالک

سالانہ ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ـــــ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵- بی - گلبرگ نمبر ۲ لاہور

جلد (۲۳) | نومبر ۱۹۷۰ء | نمبر (۱۱)

فہرست

(۱) لمعات ـــــ ۲

(۲) مودودی صاحب کی تقریر (۲) ـــــ ۱۱

(۳) سکون گھر ـــــ (محترم پرویز صاحب) ۱۷

(۴) قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔ (محترم پرویز صاحب) ۲۲

(۵) باب المراسلات ـــــ ۶۵

(۶) طلوعِ اسلام کالج فنڈ ـــــ سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ـــــ ۷۸

(۷) طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ـــــ ۸۰

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سعدی نے ایک جگہ لکھا ہے

خواجہ در بند و زیب ایوان است خانہ از پائے خویش ویران است

یعنی صاحبِ خانہ، گھر کے رنگ و روغن کی فکر میں ہے اور گھر کی حالت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں تک کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اس سے ملتی جلتی بات، ہمارے ہاں کے ایک شاعر نے یوں کہی ہے کہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

یعینہٖ یہی حالت آج اس مظلوم خطۂ زمین — پاکستان — کی ہو رہی ہے۔ سارا ملک اسی تگ و تاز میں دیوانہ وار مصروف ہے کہ مملکت کی زمامِ اقتدار کسی طرح ان کی پارٹی کے ہاتھ میں آجائے، اور مملکت ہے کہ اس کی وہ بنیادیں ہی ختم ہو رہی ہیں جن پر اس کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیادِ اول، دو قومی نظریہ تھا۔ یہ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد ہی نہیں تھا، خود اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ کی اساس و بنیاد بھی یہی نظریۂ حیات ہے کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ، جداگانہ، مستقل بالذات قوم ہیں اور غیر مسلم اس کے مقابل میں دوسری قوم کے افراد — دین کی دعوت کی داستان کا آغاز قصۂ حضرت نوح سے ہوتا ہے۔ انہیں خدا نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ (اور تو اور خود) تیرا بیٹا، جو ایمان نہیں لایا، تیرے اہل میں سے نہیں۔ تیرے اہل، تیری جماعت کے یہ افراد ہیں جنہیں یہ بڑے بڑے سردارانِ قوم، بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ (ان کے خیال کے مطابق) نچلے طبقے سے متعلق ہیں لیکن وہ ایمان میں تمہارے شریک ہیں۔ انہیں بچا کر اپنے ساتھ لے چلو۔ یہی اعلان حضرت ابراہیمؑ نے کیا جب اپنے باپ اور اپنی ساری قوم سے کہا کہ تم چونکہ خدا پر ایمان نہیں لاتے، اس لئے میرا تمہارے مابین کوئی واسطہ نہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے وطن کو اس طرح چھوڑا کہ پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہی پیغام حضرت

لوطؑ نے اپنی بیوی کو دیا جب کہا کہ چونکہ تم ایمان میں میرا ساتھ نہیں دے رہیں اس لئے تمہارا اور میرا رفاقت کا رشتہ باقی نہیں رہ سکتا۔ تم میرے اہل میں شامل نہیں ہو سکتیں۔ اور یہی اعلان اپنی مکمل شکل میں خدا کے آخری رسول حضور نبی اکرمؐ نے اپنے تمام خویش و اقارب، اعزہ و اقرباء، ہم قبیلہ و ہم وطن قریش کو مخاطب کر کے کہا جب ان سے کہا کہ تم خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود میرے اپنے نہیں ہو سکتے کیونکہ تم ایمان میں میرے ساتھ مشترک نہیں۔ اس کے برعکس حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ میرے اہل میں سے ہیں کیونکہ وہ دین کے رشتے میں مجھ سے منسلک ہیں۔ دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کا یہی اسلامی تصور تھا، جس کی بنیاد پر اقبالؒ اور جناحؒ ہندو اور انگریز دونوں سے یہ کہہ کر لڑتے رہے کہ تمہارا معیار قومیت یہ ہے کہ ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد بلا لحاظ مذہب، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور ہمارا معیار قومیت یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم، ایک جداگانہ قوم کے افراد۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ لڑائی، ہندو اور انگریز ہی کے ساتھ نہیں تھی خود مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا تھا ــــ اور بدقسمتی سے وہ گروہ وہ تھا جو اپنے آپ کو دین کا علمبردار کہتا تھا ــــ جو اس نظریہ کی مخالفت کرتا تھا۔ یہی تھا (متحدہ قومیت کے مؤیدین کا) وہ گروہ جس کے ایک ممتاز نمائندہ ــــ (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے جب کہا کہ "ملت از وطن است" تو اقبالؒ نے اپنے بستر مرگ سے ایک آہ جگرسوز کے ساتھ کہا کہ

چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

مطالبہ پاکستان کی یہ پہلی بنیاد تھی۔ اور اس کی دوسری بنیاد یہ تھی کہ مغربی تصور جمہوریت کے مطابق ملک کا اقتدار اعلیٰ، ملک کے باشندوں کو حاصل ہوتا ہے جسے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے روبہ عمل لاتے ہیں۔ ان نمائندوں کی اکثریت جو فیصلہ کر دے، وہ مملکت کا قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت تمام افراد مملکت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ مملکت کا اقتدار اعلیٰ، خدا کو حاصل ہے جسے وہ اپنی آخری کتاب قرآن مجید کی رو سے بروئے کار لاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو نافذ کرے اور اس کے اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت کا نظم و نسق سرانجام دے۔ اس کو اسلامی نظام، اسلامی مملکت یا قانونِ شریعت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مملکت، مغرب کے تصور جمہوریت کی رو سے قائم ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ تھے دو نظریات جن کی بنیادوں پر پاکستان کی جداگانہ آزاد مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا اور انہی بنیادوں پر اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا۔

جہاں تک پہلے (دو قومی) نظریہ کا تعلق ہے، قیامِ پاکستان کے بعد اسے اس طرح فراموش کیا گیا گویا اس کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو جو تقریر پاکستان اسمبلی میں کی تھی، اس میں اس نظریہ سے انحراف کر دیا گیا تھا لیکن ان پر یہ الزام غلط ہے۔ اس کی تردید حال ہی میں ان کے سب سے بڑے مخالف مودودی صاحب نے بھی کر دی ہے جب کہا ہے کہ وہ (قائداعظمؒ) دو قومی نظریہ اور اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی سے منحرف نہیں ہوتے تھے ـــ (تفصیل اس کی اسی اشاعت میں دوسری جگہ آپ کے سامنے آئیگی)، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قائداعظمؒ کے بعد مملکتِ پاکستان میں، نہ صرف یہ کہ اس نظریہ کو پسِ پشت ڈال دیا گیا بلکہ عملاً اس کے خلاف کیا گیا۔ پاکستان میں بسنے والے تمام باشندوں ـــ مسلمانوں اور غیر مسلموں ـــ کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا گیا۔ اسی نظریہ (متحدہ قومیت) کے مطابق یہاں آئین بنتے رہے اور اسی کے مطابق نظم و نسقِ مملکت سرانجام پاتا رہا۔ اس میں "مسٹر اور مولوی" کی بھی کوئی تخصیص نہیں تھی، نہ ہے حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی، جو اپنے تئیں دو قومی نظریہ کا علمبردار کہتی ہے اس کے کردار میں سب سے بڑا وزنی عمل یہ بتایا جاتا ہے کہ مودودی صاحب نے دو قومی نظریہ کا پرچار کیا تھا ـــ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ نظریہ وضع ہی انہوں نے کیا تھا ـــ ان کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو جو متحدہ قومیت کے نظریہ کے مطابق وضع کیا گیا تھا، عین مطابقِ اسلام قرار دیتی ہے اور اب تک مُصر ہے کہ آئندہ بھی مملکت کا آئین اسی کو تسلیم کر لیا جائے ـــ اس جماعت کی طرف سے جو انتخابی منشور شائع ہوا ہے اس میں بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم کی حیثیت نہیں دی گئی ـــ بلکہ مودودی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ، کنونشن لیگ کے مسلمان امیدوار کے مقابلہ میں ایک ہندو کو ترجیح دیں گے جو جمہوریت کے اصولوں کا حامی ہو۔ جماعتِ اسلامی کے علاوہ بھی، اسلام کی کسی دعویدار جماعت نے اس کا اعلان نہیں کیا کہ پاکستان میں دو قومیں بستی ہیں حتیٰ کہ کسی نے غیر مسلموں کے لئے جداگانہ انتخاب بھی تجویز نہیں کیا۔ (ضمناً، پاکستان کی بعض غیر مسلم جماعتوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کی جاتی ہے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے)۔ پاکستانی مولوی صاحبان میں اکثریت ان کی ہے جو ان علماء کے متبعین ہیں جنہوں نے تقسیم سے پہلے، دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات دانستہ اس نظریہ کو پسِ پشت ڈال رہے ہیں تاکہ انہیں یہ کہنے کا موقعہ ملے کہ تم نے دیکھ لیا کہ ہمارے بزرگوں کا موقف کس قدر مبنی بر حقیقت تھا۔

اور جب "مولویوں" کی یہ کیفیت ہے تو "مسٹروں" سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کو مملکت کی بنیاد قرار دیں گے! یوں مطالبہ پاکستان کی پہلی بنیاد، نسیاً منسیاً ہو چکی ہے۔

جہاں تک دوسری بنیاد ـــ یعنی مملکت میں اسلامی قوانین کے نفاذ ـــ کا تعلق ہے، اس کے لئے

یہاں نہایت سادگی و عیّاری سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ مولویوں نے اسے پیش کیا اور مسٹروں نے مصلحتاً اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ لیکن طلوعِ اسلام نے پہلے دن سے اس کی، یہ کہہ کر، مخالفت کی کہ جذباتی طور پر یہ مطالبہ بڑا مقدس ہے لیکن عملاً اسے بروئے کار لانا ناممکن ہوگا کیونکہ ان بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مدون نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ بیس بائیس برس تک (طلوعِ اسلام کو ہدفِ ملامت بنانے کے ساتھ ساتھ) اس مطالبہ کو مسلسل دہرایا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں بھی اس شق کو شامل کرایا گیا اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی۔ لیکن اس پر عملدرآمد کی باری ابھی تک نہ آئی۔ اور اب، بالآخر، ان حلقوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی فی الواقعہ کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو سکے۔ اسلامی نظام کا قصہ یوں پاک ہوا۔ اس کے بعد تجویز یہ کی گئی کہ یہاں اس فرقہ کی فقہ (حنفی) کو بطور قانونِ مملکت نافذ کر دیا جائے جس کی یہاں عددی اکثریت ہے۔ اس کے خلاف، اقلیت کے فرقوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیں اس مملکت کے متعلق مختلف نقطۂ نگاہ سے سوچنا پڑے گا — اور یوں اس مملکت کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا۔

یہ حشر ہوا اس دوسری بنیاد کا جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی۔

کتنے بے ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے!

ظاہر ہے کہ جن خطوط پر مولوی سوچ رہا ہے ان کی رو سے پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہی نہیں ہو سکتے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ طبقہ جو پہلے ہی سے سیکولر نظامِ حکومت کا قائل ہے، اسے یہ کہنے کا موقعہ مل جائے گا کہ فرمائیے! اس کے سوا اور چارہ کار کیا ہے۔ اس کا کوئی معقول جواب تو کسی کے پاس ہوگا نہیں لیکن چونکہ سیکولر نظام میں مولوی کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے (یا شخصی قوانین تک سکڑ کر رہ جاتا ہے) اس لئے وہ محض اپنے اقتدار کی خاطر، یہاں کفر اور اسلام کی جنگ چھیڑ دے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے، اس کے نتائج و عواقب کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے گا۔ یہاں صورتِ حالات یہ ہوگی کہ

(۱) اگر، آئندہ الیکشن کے نتیجہ میں، مجوزہ مجلسِ دستور ساز میں، مولوی طبقہ (جسے اب "اسلام پسند" کی جدید اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے) کی اکثریت ہوئی تو وہ کسی ایک فرقہ کی فقہ (مثلاً فقہ حنفی) کو ملک کا قانون قرار دینے کا طے کر لیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مختلف فرقوں میں "جہاد" (یعنی خانہ جنگی) شروع ہو جائے گی۔ اور

(۲) اگر اس اسمبلی میں وہ لوگ اکثریت میں آ گئے جو، یا تو ویسے ہی سیکولر نظام کے حامی ہیں، اور یا جو مذکورہ

صدر خطرہ کے پیشِ نظر اس کے سوا چارہ ہی نہیں دیکھیں گے کہ یہاں سیکولر نظام رائج کر دیا جائے تو موتوی طبقہ ان کے خلاف اعلانِ جہاد (خانہ جنگی) کر دے گا۔

اول تو ان دونوں صورتوں میں ملک ایسے خلفشار کی نذر ہو جائے گا جس میں مملکت کا وجود ہی مخدوش ہو جائے گا اور اگر مملکت کا وجود باقی بھی رہا تو ملک میں یہ خیال ابھرے گا کہ

(۱) جب یہاں دو قومی نظریہ بھی باقی نہیں رہا ۔ اور

(۲) ملک میں اسلامی نظام بھی قائم نہیں ہو سکا ۔ تو

مملکتِ پاکستان کے الگ وجود کی وجہ جواز کیا ہے۔ کیوں نہ اس کا ہندوستان سے الحاق کر کے دونوں ملکوں میں جنگ کے امکانات کے مستقل خطرہ کو ختم کر دیا جائے۔ اس سے وہ لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔ جو پہلے ہی ہندوستان اور پاکستان میں کنفیڈریشن کے تصورات ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ نیز وہ بھی جو مشرقی پاکستان کو جداگانہ مملکت بنانے کی آوازیں اٹھا رہے ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اور ملک کے لیڈرانِ کرام ہیں کہ ان کے سامنے الیکشن جیت کر اقتدار حاصل کرنے کے سوا، کوئی اور مقصد نہیں۔ آپ ان کی دھواں دار تقریروں کو سنیئے۔ ان کے شعلہ بار بیانات کو پڑھیئے۔ ان میں آپ کو پاکستان کی بنیاد اوّل ـــ دو قومی نظریہ کا تو کہیں سراغ تک نہیں ملے گا۔ باقی رہی دوسری بنیاد سو اس کے لئے وہ محض روشِ عامہ کی تقلید میں ـــ عوام کو بہلانے کی خاطر ـــ "کتاب و سنت" کا نام تبرکاً ضرور لیں گے لیکن اس کے ان مضمرات کا کبھی ذکر تک نہیں کریں گے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ نہ ہی کوئی ان سے پوچھے گا کبھی کہ جب کتاب و سنت کی رُو سے ملک کے لئے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین بن ہی نہیں سکتا، تو آپ اُٹھتے بیٹھتے اس کی رٹ کیوں لگاتے رہتے ہیں؟ آپ نے دیکھا کہ الیکشن کے لئے کس قدر دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر مملکتِ پاکستان کے قیام و بقار کا دارومدار ہے، ان کا کسی کو خیال تک بھی نہیں۔ ایسے "شیخ چلی" قسم کے لوگ بھی شاید ہی کہیں ملیں جو کرسیاں کھینچنے کے لئے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیں لیکن اس کا کبھی خیال تک بھی نہ کریں کہ اس زمین کی کیا حالت ہے جس پر ان کرسیوں کو بچھایا جائے گا۔

الیکشن اور ووٹ کے متعلق اگرچہ ہم اپنا موقف اچھی طرح واضح کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود احباب ہم سے مشورہ طلب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے دل میں ان احباب کی قدر ہے جنہیں ہم پر اتنا اعتماد ہے کہ ہم جو مشورہ بھی دیں گے وہ خلوصِ دیانت اور قرآنی بصیرت پر مبنی ہوگا۔ تصریحاتِ بالا کی روشنی میں ان احباب سے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پاس ووٹ کے لئے آئیں آپ ان سے حسبِ ذیل سوالات ضرور کریں اور دیکھیں کہ وہ ان کا کیا جواب دیتے ہیں۔

(۱) کیا آپ دو قومی نظریہ کو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے سمجھتے اور قیامِ پاکستان کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا تصور نہیں کرتے تو پھر انہیں اسلام یا پاکستان کے بہی خواہ ہونے کی حیثیت سے ووٹ مانگنے کا حق ہی نہیں۔ اگر وہ اس کا اقرار کریں تو پھر ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے اپنے منشور میں یہ شق رکھی ہے۔ وہ کہیں گے کہ اس میں عملی دشواریاں ہیں۔ تو ان سے کہیے کہ جو چیز اسلام اور پاکستان دونوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، آپ کا فریضہ ہے کہ اس کی راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کا حل تلاش کرو۔ نہ یہ کہ دشواریوں کی وجہ سے سرے سے اس بنیاد ہی کو ڈھا دو۔

(۲) دوسرا سوال ان سے یہ پوچھئے کہ کیا آپ کے پروگرام میں یہ شامل ہے کہ مملکتِ پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا جائے۔ اس کا جواب ہر ایک کی طرف سے "ہاں" میں ملے گا۔ تو پھر ان سے پوچھئے کہ اس کے لئے آپ عملی پروگرام کیا اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم آئین میں یہ شق رکھیں گے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نافذ نہیں کیا جائے گا۔ آپ ان سے کہیئے کہ آپ کی بات کا تو اب ہر ایک کو اعتراف ہے کہ "کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس صورت میں آپ کتاب و سنت کی بنیاد پر ایسا ضابطہ قوانین کیسے مرتب کر سکیں گے جس کا اطلاق تمام مسلمانانِ پاکستان پر (بطور قانونِ شریعت) یکساں طور پر ہو؟ یہاں پہنچکر ان کا یہ دعویٰ بھی خاک بسر ہو جائے گا۔

یہ دو باتیں تو اساسی اور اصولی ہیں۔ اور جس کے پاس ان کا اطمینان بخش جواب نہیں، اسے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ مانگنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کے علاوہ عملی سیاست کی روشنی میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کیا آپ کے نزدیک مملکت کے استحکام کا راز وحدت میں ہے یا انتشار میں۔ اس کا یقیناً جواب یہ ہوگا کہ اس کا راز وحدت میں ہے۔ تو اس پر ان سے پوچھئے کہ کیا حقیقی وحدت کا طریق یہ نہیں کہ مملکت کے حصوں بخروں کو ختم کر کے وحدانی اقتدار (UNITARY FORM OF GOVERNMENT) قائم کیا جائے۔ یا کم از کم مرکز کو اس قدر مضبوط رکھا جائے کہ مختلف اعضائے مملکت کے لئے من مانی کرنے کا امکان نہ رہے۔

یاد رکھئے۔ اسلام کا وفادار اور پاکستان کا بہی خواہ وہ ہے۔ جو

(۱) اس حقیقت پر ایمان رکھے اور اس کا اقرار کرے کہ اس کا عمل بھی اس کے مطابق ہوگا کہ مملکت کے آئین و قوانین کے سلسلہ میں سند اور حجت، خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) ہے۔ یہی ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتی ہے۔ جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی نظام اس کے مطابق ہوگا، وہ اسلامی کہلائیگا جو اس کے خلاف ہوگا وہ غیر اسلامی۔

(۲) دو قومی نظریہ، اسلام کا اساسی اصول اور مملکتِ پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس اصول کی رو سے،

پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان — بلالحاظ رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود، ملتِ واحدہ کے افراد ہیں۔ ان میں ان اختلافات کی بنا پر کسی قسم کی تفریق و تمیز غیر اسلامی ہے جسے پاکستان میں بار نہیں پانے دیا جانا چاہیئے۔ ان کے برعکس، پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم، اس قوم کے افراد نہیں۔ انہیں انسان ہونے کی جہت سے، وہ تمام حقوق و مراعات دی جائیں گی جو غیر مسلموں کے لئے قرآن میں مذکور ہیں۔ لیکن وہ اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکیں گے، اور نہ ہی وہ امورِ مملکت میں دخیل ہو سکیں گے۔

(۳) وحدتِ ملت کا فطری نتیجہ وحدتِ مملکت ہے۔ اس لئے مملکتِ پاکستان کو نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر تو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (جیسے کمشنریاں، ڈسٹرکٹ، تحصیلیں وغیرہ) لیکن اس میں کوئی ایسی تقسیم نہیں کی جا سکتی جس سے مملکتی اختیارات اور اقتدار مختلف اقطاع میں بٹ جائیں۔

جو ان نظریات کا قائل ہے اور انہیں عمل میں لانے کا اقرار کرتا ہے اور جس پارٹی کے منشور میں یہ شقیں داخل ہیں، اس کو اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ مانگنے کا حق ہے۔

(۲)

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

اگرچہ کارگہِ کائنات کے اکثر و بیشتر پوشیدہ راز، چشمِ انسانی کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ایک راز ایسا ہے جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے اور انسانی فکر کی مژگانِ کاوش ان پردوں کو اٹھانے میں ہنوز کامیاب نہیں ہو سکی جن سے وہ مستور ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ ایک ایسی قوم میں جو ہر اعتبار سے پستی کی انتہا تک پہنچ چکی ہو، ایک ایسا بطلِ جلیل کس طرح پیدا ہو جاتا ہے جو انسانی صلاحیتوں کے اعتبار سے گویا ان میں کا ہوتا ہی نہیں۔ (ہم نبی کی بات نہیں کر رہے کیونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ اور جب وہ جاری بھی تھا تو نبی کی تخلیق کا ادراک، حیطۂ فکرِ انسانی سے باہر تھا۔ ہمارا مطلب ایک نابغہ (GENIUS) کی پیدائش سے ہے)۔ نظریۂ ارتقاء کے ماہرین، عام قوانینِ فطرت میں اس قسم کی استثناء کو فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، لیکن یہ درحقیقت فکرِ انسانی کا اعترافِ عجز ہے جسے اصطلاح کے پردہ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں جمال الدین افغانی، سرسید، اقبال، جناح اسی فجائی ارتقاء کی نمود تھی۔ اور انہی میں مصر کے مردِ جلیل، جمال عبدالناصر کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مصر جیسی فرعونیت، ہامانیت، اور قارونیت زدہ قوم میں، ایک ایسے فوجی افسر کی اچانک نمود، جو ان ہر سہ عفاریت کے خلاف، شعلۂ جوالہ بن کر ابھرے، ان پر برقِ خاطف بن کر گرے، اور اس خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دے، فطرت کا سربستہ راز نہیں تو اور کیا ہے۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ

سِرِّ مستور یہ کہ وہ جس طرح اچانک ابھرا تھا اسی طرح اچانک نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ اس عظیم انسان کو اپنی انقلاب آفریں سرگرمیوں کے لئے بہت تھوڑا وقت ملا لیکن اس قلیل مدت میں اس نے سلطان ٹیپو کے اس زندہ جاوید مقولہ کو سچ کر دکھایا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی، بکری کی سوسالہ زندگی سے بھی زیادہ گراں بہا ہوتی ہے"۔ اس کی عظمت کا راز اس کی بے لوث زندگی اور بے داغ کردار تھا اور اسی نے اُسے عربوں جیسی ناقۂ بے زمام قوم میں ایک گونہ بزرگِ خاندان کا قابلِ رشک مقام عطا کر دیا تھا۔ اس کی سترہ سالہ انقلابی زندگی کے شب و روز جن برق رفتار سرگرمیوں اور جگر سوز پریشانیوں میں گزرے، انہیں دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی تھی کہ یہ شخص زندہ کس طرح رہ سکا ہے؟ لیکن اب معلوم ہوا — اور اس کی تصدیق اس کے قریبی رفیق محمد حسنین ہیکل کے بیان سے ہوتی ہے — کہ وہ اتنا عرصہ درحقیقت موت کو فریب دے رہا تھا۔

بڑے آدمی کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں اور ان کے اثرات بھی اسی نسبت سے دور رس اور مضرت رساں۔ ناصر سے بھی اسی قسم کی غلطیاں ہوتیں، اور انہی کی پیدا کردہ پریشانیاں درحقیقت اس کی جان لیوا ثابت ہوئیں لیکن اس کی محیر العقول کامیابیوں کا پلڑا اتنا جھکا ہوا ہے کہ تاریخ انسانیت اسے فراموش نہیں کر سکتی۔ اس جواں سال مردِ انقلاب آفریں کی بے وقت موت، خود انسانیت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چو من از دودۂ آتش نفساں می خیزد

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا —

(○)

طلوعِ اسلام کنونشن

جیسا کہ سابقہ پرچے میں اعلان کیا گیا تھا، طلوعِ اسلام کی تیرھویں سالانہ کنونشن، اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ، ۲۳، ۲۴، ۲۵ اکتوبر کو منعقد ہو رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس مرتبہ یہ کنونشن، سابقہ کنونشنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پُرشکوہ اور نتیجہ خیز ہوگی۔ طلوعِ اسلام کا پرچہ ہر مہینے کی ۲۰، ۲۱ تاریخ تک پریس میں چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں افسوس ہے کہ ہم اشاعتِ حاضرہ میں کنونشن کی روئداد شائع نہیں کر سکتے، البتہ اس میں محترم پرویز صاحب کے دو خطابات شامل کئے جا رہے ہیں — "سکونِ گہر" وہ خطاب جس سے وہ مندوبین کا استقبال کریں گے اور "قوموں کی تغیرِ فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں" جسے وہ کھلے اجلاس میں پیش کریں گے اور جو وقت کی اہم آواز ہے۔ طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ کنونشن نمبر ہو گا جس میں کنونشن کی روئداد اور دیگر خطابات و تقاریر وغیرہ شامل ہوں گی۔

— پرویز صاحب کے دوسرے خطاب کا عنوان ہے۔

جدید و قدیم میں کشمکش — کیا قانونِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

ایجنٹ حضرات، کنونیشن نمبر کی مطلوبہ کاپیوں سے ہمیں جلد مطلع فرمائیں۔

مفہوم القرآن

للہ الحمد کہ مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب یہ حسبِ ذیل شکل میں ملیگا۔

(۱) پارۂ اول جس کی ضخامت بھی زیادہ ہے اور جس کا جدید ایڈیشن مصنف کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

قیمت۔ تین روپے۔

(۲) پارہ ۲ تا پارہ ۲۷ — دو روپیہ فی پارہ

(۳) پارہ ۲۸، ۲۹، ۳۰ تینوں یکجا، جو ضخیم بھی ہیں اور حال ہی میں شائع کئے گئے ہیں۔ قیمت۔ دس روپے

(۴) مجلدات۔ دس دس پارے، تین نہایت خوبصورت، مضبوط، سنہری جلدوں میں مجلد۔

قیمت۔ جلد اول۔ پچیس روپے، جلد دوم۔ پچیس روپے، جلد سوم۔ تیس روپے

مکمل سیٹ۔ اسی روپے

یہ سب قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں۔ جلد حاصل کر لیجئے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

ملنے کا پتہ:- (۱) ادارۂ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

(۲) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح۔ بوقت ۹½ بجے بمقام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور میں ہوتا ہے۔

خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے۔

ناظم

مودودی صاحب کی تقریر (۲)

طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں، مودودی صاحب کی اس تقریر کا، جو انہوں نے جماعت اسلامی کے یوم تاسیس کی تقریب پر (۲۶ اگست کو) کی تھی، جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا، بحمد اللہ کہ اس نے بڑے خوشگوار نتائج پیدا کئے۔ ان لوگوں میں جو نیک نیتی سے مودودی صاحب کو اقامتِ دین کی تحریک کا داعی سمجھے ہوئے تھے، بیشتر نے یہ تاثر لیا ہے کہ اس تجزیہ سے مودودی صاحب کی غلط بیانیاں اور فریب دہیاں اس طرح بے نقاب ہوتی ہیں کہ ان کی اصل حقیقت واضح طور پر سامنے آ گئی ہے۔ اس جماعت سے متعلقین کے دوسرے طبقہ کی طرف سے جس قسم کے سب و شتم سے لبریز (لیکن گمنام) خطوط موصول ہوئے ہیں، ان سے ان کی بلبلاہٹ نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ اور تیسری چیز یہ کہ اس وقت تک ہماری نظروں سے اس جماعت کا کوئی جریدہ ایسا نہیں گذرا جس میں ہمارے پیش کردہ حقائق کی تردید کی گئی ہو —— ان کی تردید ممکن ہی نہیں۔ طلوع اسلام کبھی کوئی غیر مستند بات نہیں لکھا کرتا ——

ہم نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب کی تقریر میں اور بھی بہت سی غلط بیانیاں ہیں جن کا جائزہ کسی آئندہ اشاعت میں لیا جائے گا۔ ان میں سے چند ایک اشاعتِ حاضرہ میں سامنے لائی جاتی ہیں۔

مسلمان قوم

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں (جب انہوں نے "سیاسی کشمکش" لکھنی شروع کی تھی)

> تو اس وقت میرے پیش نظر اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو کسی طرح اپنی قومی شخصیت اور قومی انفرادیت فراموش نہ ہونے دوں اور ان کو غیر مسلم قوم کے اندر جذب ہونے سے بچاؤں۔

ظاہر بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام کو یہاں سربلند کرنا چاہے وہ ضرور یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس پہلے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جو لوگ پہلے سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں پہلے ہمیں ان کی فکر ہونی چاہیئے کہ کہیں وہ بھی ضائع نہ ہو جائیں۔ دوسرا

> کو مسلمان بنانے کی فکر تو بعد ہی میں کی جاسکتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنا پورا زور اس کام میں صرف کر دیا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم قومیت کے اندر جذب ہونے سے بچایا جائے۔ اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ تم اپنی ایک مستقل قومیت رکھتے ہو۔ تمہارے لئے کسی طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ تم دوسری قومیت میں ضم ہو جاؤ۔
>
> (ایشیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۰ء)

یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، مسلم لیگ اور مودودی صاحب کے درمیان ما بہ النزاع مسئلہ ہی یہ تھا کہ مسلم لیگ کہتی تھی کہ موجودہ مسلمان، جیسے کچھ یہ ہیں، انہیں ہندوؤں کے اندر جذب ہونے سے بچا لیا جائے اور اس کا عملی حل یہ ہے کہ ان کی ایک جداگانہ مملکت قائم کر لی جائے۔ اس کے برعکس، مودودی صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ "پیدائشی مسلمان" ایک جنس کاسد ہیں جنہیں بچانے کی کوشش بے معنی ہے۔ یہ رہیں یا نہ رہیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہیں "مسلمان" بنانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ "یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔" "آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چڑیا ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم)۔ ان مسلمانوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ "اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔" (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان مسلمانوں کی قیمت کیا تھی جن کے متعلق وہ فرما رہے ہیں کہ انہیں ان کے بچانے کی بڑی فکر تھی۔ کہا جائے گا کہ انہوں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ مسلمان باقی رہیں یا ہندوؤں میں جذب ہو جائیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے یہی کہا تھا۔ اور انہی الفاظ میں کہا تھا۔ غور سے سنیئے۔ ان کے الفاظ تھے۔

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے

میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

(ترجمان القرآن۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"
بابت فروری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۱۵)

اس کے بعد ان کی ۱۴ اگست کی تقریر کا وہ اقتباس دوبارہ پڑھیئے جسے پہلے درج کیا گیا ہے؛ اور پھر آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ کھلا ہوا جھوٹ اور فریب دہی ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب نے سمجھ رکھا ہے کہ ان کی جماعت نے سیاسی کشمکش حصہ سوم کے سابقہ ایڈیشن (یا ترجمان القرآن کے متعلقہ پرچے) سب تلف کر دیئے ہیں' اس لئے اب وہ دھڑلے سے غلط بیانی کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ (ان کے نامۂ اعمال کے علاوہ) لوگوں کے پاس ان کی یہ تحریریں اب بھی محفوظ ہیں' اس لئے وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

کافرانہ حکومت

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

اب گویا تین مسئلے درپیش تھے۔ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائینگے ان کے لئے کیا کیا جائے۔ ملک تقسیم ہو جائے جو ملک مسلمانوں کے حصے میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بننے سے کیسے بچایا جائے اور اسے اسلامی حکومت کے راستے پر کیسے ڈالا جائے۔

ان تین مسئلوں میں سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم نہ ہو تو مسلمانوں کو بچانے کے لئے کیا کیا جائے اس سلسلہ میں آپ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا وہ اقتباس دیکھ چکے ہیں (جسے ہم پہلے درج کر چکے ہیں اور) جس میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان کا مسلمان باقی رہتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے (یعنی ملک تقسیم ہو جائے تو جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائینگے ان کے لئے کیا کیا جائے۔ سو اس سلسلہ میں ان کا عجائبانہ کارنامہ یہ تھا کہ خود بھاگ کر پاکستان تشریف لے آئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فتوے صادر فرما دیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کا ان کے ساتھ شادی بیاہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ پاکستان آنے کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

آج بعض حضرات مجھے یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم بھاگ کر پاکستان کیوں آ گئے؟ مجھے اس کا اندازہ ہے کہ پاکستان میں میرا موجود ہونا ان کے لئے کس قدر شدید غم کا موجب ہے اور اس غم میں میری دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں لیکن انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں اس وقت

مشرقی پنجاب میں تھا اور اس علاقہ کو جس طرح جبراً مسلمانوں سے خالی کرایا گیا تھا اس کی وجہ سے میرے لئے پاکستان آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اور ہم کہیں گے کہ مودودی صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہندوؤں کے اس تمام جبر و استبداد کے باوجود ایسے مسلمان بھی تھے جو مشرقی پنجاب میں بدستور ڈٹے رہے اور انہوں نے حالات کا بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا۔ اور مرتے دم تک وہیں رہے۔ ہمارے سامنے ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ساری بستی میں تنہا (ایک) مسلمان گھرانا رہا، مسلمان کی حیثیت سے جیا اور مسلمان کی حیثیت سے مرا۔ لیکن سنیئے۔ مودودی صاحب تو یہ فرما رہے تھے کہ ان کے پیش نظر جو تین مسائل تھے ان میں تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کے راستے پر کس طرح ڈالا جائے۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا آپ پاکستان اپنے اس مشن کے لئے برضا و رغبت آئے تھے یا ہندوؤں کے دھکیلے ہوئے جبراً؟

اب آئیے ان کے اس دعوے کی طرف کہ ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلام کی طرف کیسے لایا جائے — یہ بھی صریحاً غلط بیانی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مودودی صاحب سے کہا جا رہا تھا کہ اس وقت انگریز اور ہندو کے خلاف جو سیاسی جنگ ہو رہی ہے اس میں ہمارے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک خطۂ زمین حاصل کر لیا جائے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے گا تو پھر اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش کر لی جائے گی — سنیئے کہ اس کا مودودی صاحب کیا جواب دیتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا۔

> بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات، اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۲۶)

سوال یہ ہے کہ جب آپ کو یہ یقین تھا کہ اگر قومی حیثیت سے مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو اس میں اسلامی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے۔ تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت آپ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان کی کافرانہ حکومت کو اسلامی کس طرح بنایا جائے! کیا یہ دونوں باتیں باہمد گر متناقض نہیں؟ اور پھر یہ کہ جب آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ قومی اسٹیٹ، اسلامی مملکت نہیں بن سکتا، تو آپ تئیس سال سے یہاں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟

جماعت اسلامی سے متعلق (یا عقیدت مندوں) میں سے بعض حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ مودودی صاحب نے جو کہا ہے کہ بانیانِ پاکستان کا یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کا ارادہ نہیں تھا یہ بالکل صحیح ہے ــــ ہم اسے تسلیم کریں گے یا نہیں اسے چھوڑیئے۔ آپ یہ فرمایئے کہ اسے آپ تسلیم کرینگے یا نہیں کہ مودودی صاحب کے اس بیان کے بعد کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس قومی اسٹیٹ میں اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہوگا، ان کی طرف سے یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی تگ و تاز، محض فریب ہے یا نہیں جس بات کو ایک شخص ناممکن العمل سمجھے اس کے لئے کوشاں ہونا یا خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

لیکن ان حضرات کو اس میں بھی کوئی تضاد دکھائی نہیں دے گا۔ اندھی عقیدت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظام

یہ حضرات کہتے ہیں کہ "مودودی صاحب نے اس راز کو پالیا تھا کہ بانیانِ پاکستان کا یہ ارادہ ہی نہیں تھا کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہو" اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مودودی صاحب کی پہلے دن سے آج تک یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں اسلامی نظام رائج نہ ہونے پائے۔ اور اس کے لئے ہمارے پاس کھلے کھلے دلائل موجود ہیں، غور سے سنیئے۔

مودودی صاحب نے یہاں روزِ اول سے یہ کہنا شروع کیا ــــ اور اب تک کہتے چلے آرہے ہیں کہ اسلامی نظام سے مقصد یہ ہے کہ

(۱) پبلک لاز تمام مسلمانوں کے لئے کتاب و سنت کے مطابق نافذ ہوں۔ اور

(۲) پرائیویٹ (شخصی) قوانین کی حد تک مختلف فرقوں کی کتاب و سنت کی تعبیر اپنی اپنی ہو۔

پہلے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رُو سے وہ کونسا اسلامی نظام ہے جس میں پبلک لاز اور پرائیویٹ لاز کی اس طرح کی تفریق جائز ہو؟ کیا کتاب اللہ کی رُو سے یہ تفریق جائز ہے؟ یا کیا سنتِ رسول اللہ میں اس کا کہیں جواز آیا ہے؟ کتاب و سنت کی رُو سے تو فرقوں کا وجود ہی غیر اسلامی ہے۔

اب آگے چلیئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے ایسے پبلک لاز مدوّن کئے جاسکیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک "اسلامی ہوں! (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں بالتصریح لکھا جاچکا ہے۔) اب خود مودودی صاحب کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو" جب صورت یہ ہے تو کیا مودودی صاحب کے اصول کے مطابق، پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین نافذ کیا جاسکتا ہے جسے تمام فرقوں کے مسلمان اسلامی تسلیم کرلیں!

فرمایئے! پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے راستے میں کون رکاوٹ بن کر کھڑا ہے؟ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں فقہ حنفی کو بطور ضابطہ قوانین نافذ کردیا جائے۔ کیا اس ضابطہ کو تمام فرقے اسلامی تسلیم

کرلیں گے؟

لیکن ٹھہریئے۔ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے گی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کا حربہ ہے ورنہ عملاً وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ تمام مسلمان ایک نظام کے تابع زندگی بسر کریں۔ وہ اپنی (۲۰ اگست والی) تقریر میں کہتے ہیں کہ

> لیکن ہر مسئلہ میں قرآن و سنت کے ارشادات و احکام کی لازماً صرف ایک ہی تعبیر نہیں ہو سکتی بلکہ مختلف تعبیریں ممکن ہیں اور عملاً کی بھی گئی ہیں جن کی بدولت مسلمانوں میں مختلف مکاتب فکر[1] رکھنے والے گروہ پائے جاتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنے اندر یہ رواداری پیدا نہیں کریں گے کہ ہم میں سے جو گروہ جس تعبیر کو صحیح سمجھتا ہو اس پر خود عمل کرے اور دوسرے گروہ پر اپنی تعبیر کو زبردستی نہ ٹھونسے بلکہ اس کا بھی یہ حق تسلیم کرے کہ جو تعبیر اس کے نزدیک صحیح ہے اس پر وہ عمل کرتا رہے تو ہمارے لئے مل کر کام کرنا اور پورے ملک میں قرآن و سنت کا قانون نافذ کر دینا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

یعنی یہ رواداری (کہ ہر فرقہ اپنی اپنی تعبیر کے مطابق عمل کرے اور دوسروں پر اپنی تعبیر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے) جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کے قیام کی کوشش تک تو برقرار رہے گی لیکن جب اسلامی نظام قائم ہو جائے گا تو پھر اس رواداری کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس وقت مودودی صاحب کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ قرآن و سنت کی جس عملی تعبیر کو یہ صحیح سمجھتے ہیں اسے دوسروں پر زبردستی ٹھونس دیا جائے۔

یہ ہے وہ "اسلامی نظام" جس کی تنفیذ کے لئے مودودی صاحب کوشاں ہیں! کیا اس قسم کے نظام کا قیام ممکنات میں سے ہے؟ جو شخص خالی الذہن ہو کر ان حقائق پر غور کرے گا اُسے اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ مودودی صاحب کی ساری زندگی تضادات کا مجموعہ ہے اور ان کی زیر نظر تقریر غلط بیانیوں کا مرقع۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ چاندی اور سونے کی چمک نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ ان لوگوں کو اس قدر کھلی ہوئی حقیقتیں بھی دکھائی نہیں دیتیں!

---

[1] آپ دیکھتے ہیں کہ فرقوں کے وجود کو لفظی ابر کھیر سے کن پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے!

باسمہٖ تعالیٰ

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا

با اضطرابِ موج —————

سکونِ گہر

بدہ

پرویز صاحب کا خطاب

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷ء کے مندوبین کا

استقبال کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سکون گہر

ساز ی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

رفیقانِ محترم و زمیلانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

للہ الحمد کہ عمر کی کشتیٔ رواں نے اتنی مہلت اور دے دی کہ ایک سال کی مفارقت کے بعد آپ رفقاءِ منزلِ قرآنی کی اجتماعی ملاقات ایک بار پھر وجۂ نشاطِ روح اور موجبِ سرورِ قلب بن گئی۔ لیکن میری عمر کی یہ مہلتیں بھی ایک گونہ آپ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ آپ کنونشن میں تشریف لاتے ہیں تو آپ کے محبت بھرے سینوں کی حرارت اور خلوص آمیز نگاہوں کی تمازت۔ آپ کی پُرکشش مسکراہٹوں کی لطافت اور آپ کی کشادہ جبینوں کی طلعت، جو آپکے ذوقِ قرآنی کی آئینہ دار اور آپ کے جذبِ دروں کی عکاس ہوتی ہے، میری آرزوؤں کو اس قدر جوان اور میرے ارادوں کو اتنا مستحکم بنا دیتی ہے کہ مجھے زندہ رہنے کا سہارا مل جاتا ہے۔ لہٰذا میرے عزیزو اور غمخوارو! میرے رفیقو اور ہمسفرو! یہ جو مجھے پھر سے جینے کی مہلت مل جاتی ہے تو یہ درحقیقت آپ ہی کی نوازشہائے پیہم کا تصدق ہے۔

یہ غنچوں کی نکہت، یہ پھولوں کی رنگت
انہی کا تبسم، انہیں کے اشارے

آپکے اس کاروانِ شوق و مستی میں اکثریت ان رفقاء کی ہے جنہوں نے میری دعوت کی اولین منزل میں اس بانگِ درا پر لبیک کہا اور اس کے بعد راہِ طلب کی ہزار صبر آزما دشواریوں، اور جب وہ منزل کی صد ہزار ہمت شکن صعوبتوں کے باوجود، نہ کہیں ایک قدم پیچھے ہٹے، نہ کسی اور جانب کنکھیوں سے بھی دیکھا۔ اگر یہ درست ہے — اور اس کے درست ہونے میں شبہ ہی کیا ہے — کہ "وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے" تو اس قسم کے پیکرانِ خلوص و استقامت کی پختگیٔ ایمان میں کس کافر کو شک ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! اگر

کسی کو سفرِ زندگی میں اس قسم کا ایک ساتھی بھی مل جائے تو یہ اس کے بخت کی انتہائی فیروزمندی کی دلیل ہوتی ہے۔ سوچئے کہ دنیا میں میرے جیسا خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے جسے اس قسم کے رفقائے سفر اتنی کثرت سے میسر آ گئے ہوں۔ اپنے بخت کی اس سعادت پر میری جبینِ نیاز بدرگاہِ رب العزت جس قدر سجدہ ہائے تشکر بھی پیش کرے کم ہے۔ یہی تو وہ مقام ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں۔

(۰)

سالِ گذشتہ کے طوفان

برادرانِ عزیز! جب سالِ گزشتہ ہم انہی دنوں اس مقام پر جمع ہوئے تھے تو اس وقت ہمارا ملک جن آندھیوں کے طوفان میں گھرا ہوا تھا میں نے ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا کہ

> یہ سال پاکستان کے لئے ہی نہیں، تمام اقوامِ عالم کے لئے عجیب ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں کا سال رہا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ تاریخ انسانیت کے شش ہزار سالہ ہنگامے جو فضا کی سرماتی چادریں اوڑھے ساکت و صامت محوِ خواب تھے، زمانے کے تقاضوں کے صورِ اسرافیل سے یک بیک بیدار ہو کر۔ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ۔ فضا کی پہنائیوں سے فرشِ زمین پر آن اترے ہیں اور آتشیں عفاریت کی طرح چیختے چلاتے، دھاڑتے، غرّاتے، اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں۔ اور یہ سیلابِ جہاں آشوب کسی کے تھامے نہیں تھمتا — جلسے، جلوس، احتجاجات، مظاہرات، الزام تراشیاں، دشنام طرازیاں، خشت باریاں، آتش زنیاں، خوں ریزیاں، غارت گریاں، پتھراؤ، گھیراؤ — غرضیکہ کونسا جناتی حربہ تھا جو قصرِ آئین و قوانین کی بنیادوں تک کو ہلا دینے اور شجرِ تہذیب و تمدن کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے لئے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ یہ آگ چونکہ عالم سوز تھی، اس لئے خطۂ پاکستان اس سے کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا؟ یہ بھی اس کی لپیٹ میں آیا، اور بُری طرح آیا۔

لیکن، اس کے ساتھ ہی میں نے یہ کہہ کر طمینان کا سانس لیا تھا کہ

> للہ الحمد کہ ہمارا یہ مختصر سا کاروانِ جذبِ مستی، ان ہنگامہ خیزیوں سے یکسر محفوظ رہا اور کہیں سے اس قسم کی خبر موصول نہیں ہوئی کہ عزیزانِ طلوعِ اسلام کے کسی رکن نے ان ہنگاموں میں کسی قسم کا بھی حصہ لیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآنی تعلیم کا اعجاز ہے جو اس

قسم کی عالمگیر شورشوں میں بھی دماغی توازن کھونے نہیں دیتا۔

درجنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست!

یہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی بات ہے جب یہاں ہنوز سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عاید تھیں۔ جب جنوری ۱۹۷۰ء

سالِ رواں کی تلاطم خیزیاں

میں یہ پابندیاں اٹھا دی گئیں تو اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتے کہ الٰہ دین کے افسانے کا جن، اس طرح بوتل سے باہر نکل آیا کہ اسے پھر سے بوتل میں بند کرنا، خود الٰہ دین کے بس میں بھی نہ رہا۔ پہلے جو آندھیاں تھیں، وہ بے پناہ جھکڑ بن گئیں۔ جو چنگاریاں تھیں وہ شعلۂ جوالہ میں تبدیل ہو گئیں۔ پہلے جو دریا کے پُرشور تھے وہ بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑے۔ جو جھٹکے تھے انہوں نے ارض پاش زلزلوں کی صورت اختیار کر لی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے، سارا ملک ان جھکڑوں اور سیلابوں، ان شعلوں اور زلزلوں کے نرغہ میں اس طرح آ گیا کہ پھر نہ کسی کی عزت محفوظ رہی نہ آبرو مصئون۔ نہ جان کا تحفظ رہا نہ مال کا۔ شرافتیں لٹ گئیں، نجابتیں برباد ہو گئیں۔ نظم و نسق تہ و بالا ہو گیا، اطمینان و سکون عہدِ رفتہ کا افسانہ بن گیا۔ کیا لیڈر اور کیا ان کے متبعین، سب اس آتشیں رقص میں ننگے ناچ رہے تھے۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ ان تمام قیامت فراموش ہنگاموں میں ایک طلوعِ اسلام تھا جس نے نہ اپنے ہوش و حواس کھوتے، نہ دماغی توازن بگڑنے دیا۔ سارے ملک میں یہی ایک گوشہ تھا جہاں سے

طلوعِ اسلام کی پکار

یہ آواز برابر ابھر رہی کہ پاگلو! سوچو۔ یہ جو تم اپنے ہاتھ سے تباہیاں لا رہے ہو، یہ کس کی تباہیاں ہیں؟ ذرا ہوش میں آؤ۔ آنکھ کھول کر دیکھو۔ وہ کون ہیں جن کی عزتیں برباد ہو رہی ہیں، وہ کون ہیں جن کی شرافتیں لٹ رہی ہیں؟ وہ کون ہیں جن کی بربادیوں کا تماشا ساری دنیا دیکھ رہی ہے اور جن کی تباہیوں پر دشمن کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے جا رہے ہیں۔ اپنی ان مجنونانہ حرکات کو ذرا روکو اور سوچو کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

ہر چند طلوعِ اسلام کی یہ پکار (بظاہر) نقار خانہ میں طوطی کی آواز تھی لیکن اس نے اسے برابر جاری رکھا۔ اقبالؒ نے اپنے دور کی ہنگامہ خیزیوں سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

وہ اگر آج زندہ ہوتے تو اپنے اس دور کی ہوائے تند و تیز کو اس زمانے کے جھکڑوں کے مقابلہ میں، نسیمِ سحری کہہ کر

پکارتے۔ الحمد کہ طلوعِ اسلام نے ان عفریتی جھکڑ دلیں' اپنے اس ننھے سے دیئے کو روشن رکھا' اور اس چراغ نہ داماں کو لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ سرکش جذبات کی آندھیوں اور بیباک ہنگامہ خیزیوں کے جھکڑوں میں' قرآنی بصیرت کے چراغ کو روشن رکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' اس کے لئے آپ اپنی تحریک کے دو ایک دعاوی اور اس بیس یا پچیس سال کی کشمکش کے بعد' ان کے نتائج کو مثالاً سامنے لایئے، بات واضح ہو جائے گی۔

جماعتِ اسلامی کی مخالفت

(۱) تقسیم ہند سے بہت پہلے، جب ہندوستان میں جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، تو طلوعِ اسلام نے اس تحریک کے مضمرات پر غور کیا اور دیکھا کہ اس میں ملت اور دین دونوں کے لئے کس قدر خطرات پوشیدہ ہیں — مذہب انفرادی رہتا ہے تو جہالت اور توہم پرستی کا موجب بنتا ہے، لیکن جب وہ منظم ہو کر سیاست کا روپ دھار لیتا ہے تو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے' اس سے زیادہ شدید اور مہیب استبدادی پنجہ کوئی اور نہیں ہوتا۔ یورپ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ عیسائیت جب تک انفرادی مذہب رہی' مسلکِ خانقاہیت اختیار کئے رہی۔ لیکن جب اس نے منظم کلیسا کی شکل اختیار کر لی تو جو کچھ انسانوں کے ساتھ ہوا، تاریخ کے رنگین اوراق اس کی بین شہادت ہیں۔ انبوہ در انبوہ مخالفین کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کی کھالیں کھنچوائی گئیں، زبانیں کاٹی گئیں، ہونٹ سئے گئے۔ انہیں پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا، ایک ایک عضو کاٹ کر' انہیں تڑپا تڑپا کر مارا گیا، تنگ و تاریک غاروں میں عمر بھر کے لئے محبوس رکھا گیا، ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، کتابیں جلائی گئیں، مسودات تلف کئے گئے، ان کے گھر بار نذرِ آتش کئے گئے، ان کے بال بچوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ ارباب کلیسا کی سلبیت و بربریت کی دہشت سے عوام تو ایک طرف، سلطنتیں اور حکومتیں بھی لرزاں و ترساں رہتی تھیں — یہ ہوتا ہے منظم مذہب سیاست کے پیرہن میں — یہ تھا وہ احساس جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ اس کی یہ آواز سارے ملک میں یکتا و تنہا تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد' اس جماعت کے عزائم بیرونِ پردہ آنے شروع ہو گئے، اور طلوعِ اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اسی نسبت سے ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس جماعت کے متعلق عام تأثر بھی تھا کہ یہ اقامتِ دین کی داعی اور اسلامی نظام کے لئے کوشاں ہے' اس لئے طلوعِ اسلام کی طرف سے اس کی مخالفت سطح بین حضرات کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، کیونکہ طلوعِ اسلام کی تحریک خود اقامتِ دین کی داعی اور اسلامی نظام کی مبلغ تھی۔ یہ غلط فہمی' یا ان دونوں تحریکوں کے مقاصد میں التباس' اس قدر عام تھا کہ' اور تو اور' خود طلوعِ اسلام کے قریبی حلقوں سے بھی اس قسم کی آوازیں اکثر سنائی دیا کرتی تھیں کہ اسے' اس جماعت کی مخالفت کی روش ترک کر دینی چاہیئے۔ لیکن طلوعِ اسلام جو کچھ کر رہا تھا' علیٰ وجہ البصیرت کر رہا تھا۔ اس میں نہ کسی قسم کی ذاتی رقابت کا کوئی شائبہ تھا نہ مفادات کے تصادم کا اندیشہ۔ اس کی مخالفت کی بنیاد صرف اس جذبہ اور احساس پر تھی کہ پاکستان

اور اسلام کو اس تحریک کے مہیب خطرات سے بچا لیا جائے۔ اس لئے اس نے اپنوں کی نصیحت اور بیگانوں کی سرزنش کے باوجود اس مخالفت کو جاری رکھا۔ اس کی اس استقامت کا نتیجہ ہے کہ آج اس جماعت کے عزائم یکسر بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آ گئے ہیں اور ملک کے ہر گوشے سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی ہے۔

طلوع اسلام نے جو آواز آج سے تیس سال پہلے اٹھائی تھی،

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

یہ ہے عزیزانِ من! حق و صداقت کے مٹی کے دیئے کو حوادث زمانہ کے تھپیڑوں کے علی الرغم جلائے رکھنے کا نتیجہ۔ اب دوسری مثال کو سامنے لائیے۔

قوانینِ شریعت کی تدوین

(۲) تشکیلِ پاکستان کے بعد مذہب پرست طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ چونکہ اس مملکت کو اسلامی مملکت بنانا مقصود ہے اسلئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ یہ مطالبہ اس قدر مقدس، مسلّم اور معصوم سا تھا کہ کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کسی طرف سے اس کی مخالفت ہو گی۔ لیکن طلوع اسلام نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اسلامی ضابطہ قوانین اسے کہتے ہیں جسے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کریں اور اس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو پاکستان میں بسنے والے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ جب ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے تو اپنے آپ کو یا اہل پاکستان کو اس فریب میں رکھنے سے کیا حاصل؟ اور اگر کسی ایک فرقہ کے ضابطہ قوانین کو تمام فرقوں پر زبردستی ٹھونسا گیا تو اس کے نتائج اس قدر خطرناک ہونگے جس سے خود مملکت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسلامی مملکت کے لئے ضابطہ قوانین مرتب کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مختلف فرقے اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر، قرآن کریم کو قانون کی سند اور حجت تسلیم کریں اور حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھتے ہوئے، ایک جدید فقہ مرتب کریں۔ اگر مختلف فرقے ایسا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو فریب میں رکھا جائے اس کا اعتراف کر لیا جائے کہ مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کرنا ممکن نہیں۔

طلوع اسلام کی اس آواز کی جس شد و مد سے مخالفت ہوئی اس سے آپ احباب مجھ سے بھی زیادہ واقف ہیں، کیونکہ اس کے ہدف، ہر مقام پر آپ حضرات تھے۔ آپ کو اس کا براہِ راست تجربہ ہے ــــ یہ منکرینِ حدیث ہیں، منکرینِ رسالت ہیں، ملحد ہیں بے دین ہیں، ایک نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں ــــ یہ اور نہ جانے اور کس کس قسم

کے لیبل ہم پر چسپاں کئے گئے۔ یہ غوغا اتنی شدت سے بلند کیا گیا کہ میرے مخلص ترین دوستوں تک نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا کہ تم خواہ مخواہ حدیث اور سنت کی نظری بحث میں الجھ رہے ہو اور اس طرح ساری قوم کی مخالفت مول لے رہے ہو۔ ہماری دعوت رجعت الی القرآن کی دعوت ہے۔ تم اسے مثبت طور پر پیش کئے جاؤ۔ حدیث یا سنت کا تعلق مسلمانوں کے نازک ترین جذبات سے ہے۔ ان مباحث میں الجھ کر تم اس قدر بدنام ہو جاؤ گے کہ غیر تو غیر جن لوگوں کے تمہارے ساتھ نہایت مخلصانہ تعلقات ہیں وہ بھی ـــ کم از کم دوسروں کے سامنے ـــ تمہاری مخالفت نہیں تو لاتعلقی کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ـــ مجھے بھی اس کا علم اور احساس تھا کہ اس مخالفت کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن قرآن اور پاکستان کی طرف سے جو فریضہ مجھ پر عاید ہو رہا تھا اس کی اہمیت میرے نزدیک ان مخالفتوں کے مآل و عواقب سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ کتاب سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکنات میں سے نہیں جس پر مختلف فرقوں کے مسلمان متفق ہو سکیں؛ اس لئے اگر ہم نے آئین پاکستان میں یہ شق رکھ لی اور اس کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہ کر سکے، جسے یہاں کے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں، تو غیر مسلم اقوام عالم تو ایک طرف خود مسلمان بھی یہ محسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ ایک زندہ نظام زندگی بن گیا تھا لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ کسی مملکت کا آئین اور ضابطۂ قوانین اس کے مطابق مرتب ہو سکیں۔

یہ تھا وہ احساس جو مخالفتوں کے اس بے پناہ سیلاب کے علی الرغم، مجھے اس آواز کو بلند کئے جانے پر مجبور کر رہا تھا، میں نے ان مخالفتوں کی پرواہ نہ کی اور اپنی بات کو دہرائے چلا گیا ـــ آج میرا سر نیاز بدرگاہ صمدیت ما بیں جھکا ہے کہ بیس پچیس سال کی مسلسل تگ و تاز کے بعد حقیقت نے اپنے آپ کو منوا لیا، اور ـــ جیسا کہ آپ نے طلوع اسلام کی ماہ رواں کی اشاعت میں دیکھ لیا ہوگا' اس آواز کی سب سے بڑی مخالف جماعت اسلامی کے امیر کو بالآخر یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ فی الواقعہ۔

کتاب سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہوں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی تحریک کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے ایک کنونشن کے اجتماع میں کہا تھا کہ ؎

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم رستے پہ واعظ کو
کہ سمجھانا ہوا اب نادر میخانہ آتا ہے

زمانے کے تقاضوں نے ان حضرات کو اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور کر دیا ہے کہ کتاب سنت کی بنیاد پر کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لا کے بعد اگر یہ حضرات إلاّ کی منزل تک بھی پہنچ گئے اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لیا کہ ایسا ضابطۂ قوانین قرآن مجید کی بنیادوں ہی پر مرتب ہو سکتا ہے، تو پھر اہل پاکستان ہی نہیں عالم انسانیت کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ' اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے

نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو ۔۔۔۔۔۔ اس تو کا جواب مجھ سے نہیں اقوام سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھئے! (یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا)۔ (چونکہ میں ان موضوعات پر اپنے آئندہ خطابات میں تفصیلی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اس لئے اس وقت اس اختصار پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا)۔ بہرحال، آپ کی اس خاموش دعوت کے جو نتائج اس وقت تک میرے سامنے آئے ہیں وہ بھی کچھ کم اطمینان بخش اور حوصلہ افزا نہیں۔

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

اور یہ آپ حضرات کی بہت بڑی کامیابی ہے اور خوش بختی کی علامت جس کے لئے میں آپ تمام احباب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

جو گرم جوش نوجوان اعتراض کیا کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کیا نتائج پیدا کر سکتی ہے، اسے چاہیئے کہ کوئی عملی پروگرام اختیار کرے، آپ ان سے پوچھئے کہ جو نتائج اس فکری تحریک نے پیدا کئے ہیں ان کا کوئی شائبہ تک بھی اُن جماعتوں کے ہاں نظر آتا ہے جنہیں آپ روبہ عمل سمجھتے تھے۔ انہیں اپنی عمر بھر کی صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں کے بعد بالآخر اسی مقام کی طرف آنا پڑا جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا تھا۔ آپ کو ان کے ہاں گرج، کڑک، چمک تو ملے گی لیکن اس ابرِ گہربار کا چھینٹا تک دکھائی نہیں دے گا جس سے زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ کی نمود ہوتی ہے۔ یہ ابرِ نیساں آپ کو قرآنی فکر کی پیامبر تحریک ہی کے ہاں ملیگا۔

———— (٥) ————

دعوت الی اللہ کے ساتھ اگر استقامت شامل ہو تو اس تحریک کو کس طرح خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے (دیکھئے)، اس کی دو شہادتیں آپ کے سامنے آگئیں۔ اب میں اسی ضمن میں ایک اور گوشے کی طرف آتا ہوں جو ان سے بھی زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ آپ احباب اس حقیقت سے تو بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے بیج بونے اور فصل پکنے کے درمیان مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہی وہ وقفہ ہے جس کی وجہ سے خدائی پروگرام کو سست خرام قلبِ ناصبور آزما کہا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (غالب کے الفاظ میں، جنہیں کئی بار دہرایا جا چکا ہے) بیتابیٔ تمنا کی شدت کی وجہ سے صبر طلبیٔ عشق کا یہ عرصۂ دراز بڑا ہمت شکن اور زہرہ گداز ہوتا ہے لیکن جب خزاں کے بعد بہار کی آمد آمد ہوتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ صحنِ چمن کے ذرّے ذرّے سے حیاتِ تازہ کس طرح انگڑائیاں لے کر ابھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔۔۔ یہ شگوفہ پھوٹا، وہ غنچہ چٹکا، یہ کلی مسکرائی، وہ پھول مہکا ۔۔۔ قرآن کی بنیادوں پر استوار فکری تحریک کا بھی یہی انداز ہوتا ہے۔ جب مہلت

کا درمیانی عرصہ ختم ہونے کو آتا ہے تو معاشرہ میں ہر طرف اس کے برگ و بار ابھرتے دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔

حدیثِ یار کے عنوان نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (۱۱۰/۲)
کا یہی مفہوم ہے۔

نظامِ ربوبیت کی دعوت

بیس سال پہلے طلوع اسلام نے یہ آواز بلند کی کہ خدا نے انسانوں کو رزق مہیا کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے، وہ اسلامی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ اس مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور مملکت اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائل رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ لہٰذا اسلامی نظام میں ذاتی املاک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس آواز کا اٹھنا تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا گیا کہ یہ کمیونسٹ ہے، دہریہ ہے۔ یہ کارل مارکس کی صدائے بازگشت ہے، یہ روس اور چین کی نقالی ہے۔ اسلام میں اس قسم کی مزدکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نظریات اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیں گے ——— اور یہ ڈگڈگی اس زور سے بجائی گئی کہ سرمایہ دار طبقہ تو ایک طرف، اربابِ نظم و نسق بھی اس سے متاثر ہو گئے۔ طلوع اسلام کے لئے یہ مرحلہ سابقہ مراحل سے بھی زیادہ دشوار گزار اور ہمت طلب تھا۔ اس سے اس تحریک کو بے حد دھچکے لگے۔ طلوع اسلام کی اشاعت اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کے فروغ پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ اسے مسلسل نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ اس کے خلاف کئی قسم کے الزامات تراشے گئے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ حالات کی اس قدر شدید نامساعدت کے باوجود طلوع اسلام کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی جنبش نہ آنے پائی اور اس نے قرآن کریم کے اس معاشی نظام کے تصور کو عام کرنے میں اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی — قرآنی فکر کی یہ جوئے رواں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ تا آنکہ زمانے کے تقاضوں نے اس میں ایسا تموج پیدا کر دیا کہ اس معاشی نظام کا مطالبہ اب ملک کا واحد مطالبہ بن گیا ہے جس کے مدمقابل کوئی دوسرا مطالبہ ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کی حدت اس قدر شدید ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کے بڑے بڑے ستون جو رومانی بتکدوں میں نصب تھے، پگھل پگھل کر بہتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مدعیانِ اقامتِ دین، جن کا فتویٰ یہ تھا کہ املاک و مقبوضات کی کسی قسم کی حد بندی از روئے اسلام حرام ہے، اور مالی تنظیمات کا قومیانہ ابلیس کا وضع کردہ انسانیت کش نظام، وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اسلام کی رو سے زمین کی ملکیت کی تحدید بھی کی جا سکتی ہے اور کلیدی صنعتوں کو مملکت اپنی تحویل میں بھی لے سکتی ہے۔ یوں عزیزانِ گرامی قدر! حقیقت اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔

رند و صوفی ہمہ سرمست گذشتند و گذشت
قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

جو حضرات طلوعِ اسلام کی اس دعوت کو الحاد و بے دینی قرار دیا کرتے تھے، آپ ان سے کہیئے کہ تم طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کے بجھنے سے دیئے کی لَو کو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اسے اپنی کف آلود پھونکوں سے گل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، اب اس لَو کا عکس ملک کے بچے بچے کے آئینہ جبیں میں جھلک رہا ہے۔ خدا ہمت کرے انہیں گل کر کے دکھاؤ۔

بجھا سکو تو بجھا دو ستم کے متوالو!
پلک پلک پہ فروزاں ہیں آرزو کے دیئے

لیکن انہیں پھونک مار کر بجھانے کی کوشش سے پہلے سعدی کی اس انتباہ کو ذہن میں رکھ لینا کہ

چراغے را کہ ایزد برفروزد
کسے کو پف زند ریشش بسوزد

رفیقانِ محترم! سوچئے کہ کیا یہ حقیقت آپ کے لئے کچھ کم باعثِ فخر و مباہات ہے کہ آپ نے جس آواز کو اتنا عرصہ پہلے بلند کیا اور جسے اتنی مدت تک صدا بصحرا سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جاتا رہا، وہ آواز آج ملک کے ہر دھڑکنے والے دل کی ترجمان بن رہی ہے۔ کیا آپ کی دعوت کی صداقت کی اس سے زیادہ درخشندہ شہادت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ آپ کی اس قابلِ رشک کامیابی پر آسمان کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے ہیں اور ــــ حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زنند

(۰)

ایک مہیب خطرہ

لیکن عزیزانِ من! اسی حسین و دلکش مقام پر مجھے آپ احباب کو ایک فریب انگیز خطرے کی چٹان سے بھی آگاہ کرنا ہے۔ وہ جو سنا کرتے تھے کہ آندھی کے طوفان میں پگڑی سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور جسے اقبالؒ نے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا تھا کہ

در جنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

میرے پیشِ نظر بھی کچھ ایسا ہی منظر ہے جسے آپ احباب کے سامنے بے نقاب لانا ضروری ہے۔

جن حضرات نے طلوعِ اسلام کی تحریک کا سطحی نظروں سے مطالعہ کیا تھا، ان کی طرف سے اب اس قسم کی آوازیں اٹھنی شروع ہو گئی ہیں کہ لیجئے صاحب! طلوعِ اسلام جس معاشی نظام کی فکری اور نظری دعوت

دینا تھا، اس کے لئے اب ملک میں عملی پروگرام شروع ہو گیا ہے، اس لئے تحریکِ طلوعِ اسلام سے وابستگان کو چاہیئے کہ وہ اس عملی پروگرام میں شریک ہوں یا کم از کم اس سے تعاون کریں۔ ان آوازوں کی سحر انگیزی کا نتیجہ ہے کہ وہ گرمجوش طبقہ جو تحریکِ طلوعِ اسلام سے متفق ہونے کا دعویدار ہونے کے باوجود شاکی رہتا تھا کہ طلوعِ اسلام کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا — یعنی ان کے نزدیک فکری کاوشوں کو عمل نہیں کہا جا سکتا — عمل وہی ہے جس کی نمود ہنگاموں اور شورشوں سے ہو — وہ جذبات کی اس رَو میں تیزی سے بہے چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ضروری ہے کہ ہم ذرا رُک کر، قلبی سکون اور ذہنی توازن کے ساتھ حقائق کا جائزہ لیں۔

آپ احباب کو بخوبی معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام 'نظامِ سرمایہ داری' کو اسلام کی ضد قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی اسی شدّ و مد سے واضح کرتا چلا آرہا ہے کہ روس یا چین کی سوشلزم کا معاشی نظام گو قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُسے قرآنی (یا اسلامی) نظام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ دونوں کی بنیادیں مختلف ہیں — اور دین کے نقطۂ نگاہ سے، اگر بنیاد کا اختلاف ہو تو بیرونی عمارت (SUPER - STRUCTURE) کی مماثلت کچھ معنی نہیں رکھتی۔

سوشلزم اور اسلام

آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں (یعنی عالمِ اسلام میں) مروجہ نماز، روزہ، حج وغیرہ ارکان کی شکل و شباہت وہی ہے جو صدرِ اول میں تھی لیکن ان سے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو اُس دور میں ظہور پذیر ہوتے تھے۔ اس لئے کہ اِن اعمالِ حیات کی بنیاد وہ نہیں رہی جو اُس زمانے میں تھی — اقبالؒ کے الفاظ میں

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آج ہر مسلمان وہی کلمہ پڑھتا ہے جو صدرِ اول کے مسلمان پڑھتے تھے، لیکن اس کلمہ نے جو قیامت خیز انقلاب اُس دور میں برپا کر دیا تھا، آج ہم اس کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں لا سکتے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ کلمہ کے الفاظ تو وہی ہیں لیکن اس کی بنیاد وہ نہیں جو اُس دور میں تھی۔ وہ بنیاد، جس پر اعمالِ حیات کے اسلامی قرار پانے کا دار و مدار ہے، قرآن کی اصطلاح میں 'ایمان' کہلاتی ہے، اور ایمان، نہ رام داس کی جگہ عبداللہ نام رکھ لینے کو کہتے ہیں نہ کلمہ کے الفاظ دہرا لینے کو۔ نہ یہ نماز، روزہ کی رسماً ادائیگی کا نام ہے، نہ چند مقدس اصطلاحات اختیار کر لینے کا۔ ایمان، قلب اور دماغ کے کامل اطمینان کے بعد صداقت کے اس طرح دل میں اتر جانے کا نام ہے جس سے انسان کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ اس کے مقاصدِ حیات بدل جاتے ہیں۔ اس کی آرزوئیں بدل جاتی ہیں۔ اس کے قلبی تقاضے

بدل جاتیں، اس کے جذباتی میلانات بدل جاتیں، اس کی زندگی ایک خاص قالب میں ڈھل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان بدوؤں کو جنہوں نے کلمہ پڑھ لینے کے بعد سمجھ لیا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ تم ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہو اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔ (۴۹/۱۴) ہنوز ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور مسلمان ہونے میں جو فرق ہے اس کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ۔ (۲/۸) ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ وہ ان نمازیوں کو جو نماز کی مرئی حرکات و سکنات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور صلوٰۃ کی غرض و غایت سے بے خبر رہتے ہیں، نہ صرف بے نماز کہتا ہے بلکہ دین کی تکذیب کرنے والے قرار دیتا اور اس روشِ زندگی کا مآل تباہی اور بربادی بتاتا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ (۱۰۷/۴-۶) حتیٰ کہ وہ اس انفاق کو بھی جس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی، کوئی وقعت نہیں دیتا۔ آپ نے کیا سورۃ النساء کی اس آیت پر کبھی غور کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ (۴/۳۸) وہ لوگ جو مال و دولت خرچ کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد دوسروں کی نگاہوں میں بڑا بننا ہوتا ہے، وہ درحقیقت خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ محض اتنی بات کہ کسی نظام کے اجزاء و تفاصیل قرآنی نظام کے مماثل ہیں، اسے اسلامی نظام نہیں بنا سکتا۔ اور جب اس قدر مماثلت بھی اس نظام کو اسلامی نہیں بنا سکتی تو کسی تحریک یا نظام کے ساتھ محض "اسلامی" کا لفظ بڑھا دینا اسے کس طرح اسلامی بنا سکتا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جماعت اسلامی نے اپنی تحریک، اپنی جماعت، اپنے ارکان، اپنے پروگرام کے چن چن کر اسلامی نام رکھ لئے، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کی نسبت سے وہ جماعت فی الواقعہ اسلامی بن گئی اور اس کا نظام اسلامی ہو گیا؟ جب ان تمام مماثلتوں اور الفاظ کی نسبتوں کے باوجود نہ یہ تحریک اسلامی قرار پا سکی نہ اس کا نظام دین کا نظام، تو ایک معاشی تحریک کو، محض اس بنا پر کس طرح اسلامی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے معاشی ڈھانچے کے خط و خال قرآنی نظام کے مماثل ہیں اور اس نے اس کا نام "اسلامی" رکھ لیا ہے۔ ان تحریکوں کو اسلامی قرار دینے کے لئے ہمیں ظواہر کی مماثلت اور الفاظ کی نسبتوں سے زیادہ گہرائی میں جانا ہوگا۔ علامہ اقبال نے

جب روس سے کہا تھا کہ تمہارا معاشی پروگرام بے شک قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے لیکن اس کے باوجود تمہارا نظام پائیدار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی عمارت "اساسِ محکم" پر استوار نہیں ہو رہی، تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم اگر سوشلزم کا نام اسلامی سوشلزم رکھ لو تو اسے اساسِ محکم میسر آجائے گی۔ اس اساسِ محکم کے سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا کہ جس طرح انسانی زندگی کو مختلف ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جا سکتا ــــ یہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اسی طرح اس کی زندگی سے متعلق نظام کے بھی حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ایک کلی نظام ہوگا جس میں سیاست معاشرت، تمدن، معیشت، تعلیم، تربیت وغیرہ تمام شعبہ ہائے حیات سموئے ہوئے ہونگے۔ اس نظام کی بنیاد وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر قائم ہوگی اور اس عظیم عمارت کا بوجھ ان افراد کے کندھے اٹھا سکیں گے جن کے قلبِ نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہوگی جو خدا اور آخرت پر ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کی آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی کی رُو سے متعین کی جائیں۔ یہی قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے جس نے کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) جو لوگ زندگی سے متعلق معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے، تو انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق قوانین کی اطاعت بھی اگر طوعاً و کرہاً کی جائے تو وہ ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴/۶۵) ان فیصلوں کی اطاعت اس طرح کی جائے کہ دل کی گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو ــــ یہ ہے خدا پر ایمان کا قرآنی مفہوم، اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت قلبِ نگاہ کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ــــ اور آخرت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی، اسی طبیعی زندگی کا نام نہیں۔ انسان، اپنے طبیعی جسم کے علاوہ، ایک اور شے کا بھی حامل ہے جسے اس کی ذات (نفس) کہا جاتا ہے۔ اگر اس کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو یہ طبیعی جسم کی موت سے بھی نہیں مرتا۔ اس کی ذات، زندگی کے اگلے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کی نشوونما مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جس کی ایک بنیادی شق یہ ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے استعمال میں لاتا ہے، اس کی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اور اسی سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اگر انسانی اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہیں آتے تو اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہاں نہ سہی، مرنے کے بعد سہی ــــ زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ــــ

یہ تھی وہ اساسِ محکم جس کے لئے علامہ اقبالؒ نے روس سے کہا تھا کہ

داستانِ کہنہ شُستی باب باب
فکر را روشن کن از امّ الکتاب

اور یہی طلوع اسلام کا پیغام ہے ہر اس تحریک اور تحریک کے داعیان اور متبعین کے لئے، جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ اقامتِ دین کی اصطلاح سے متعارف ہو اور خواہ اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم ۔ کہ اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرنے کا حق صرف اس تحریک کو ہو سکتا ہے جس کی بنیاد ہی اس ایمان پر استوار ہوں جسے قرآن نے ہر عملِ صالح کی اولین شرط قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ اصطلاحی

مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ

مسلمانوں سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۔۔۔۔ (۴/۱۳۶)۔ اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے ۔ مسلمانوں سے ایمان لانے کے مطالبہ سے مراد ہی یہ ہے کہ اپنا یا اپنی تحریکوں کا نام اسلامی رکھ کر اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ ہم مومن ہو گئے ہیں اور ہماری تحریکیں فی الواقعہ اسلامی۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی اس فریب میں مبتلا رکھے چلے جا رہے ہیں، اور دوسروں کو بھی یہ فریب دیئے جا رہے کہ محض چند الفاظ کی تبدیلی سے مملکتیں اور تحریکیں اسلامی بن جاتی ہیں جب پاکستان اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد پاس کی تھی تو جماعتِ اسلامی نے اعلان کر دیا تھا کہ اب مملکت مسلمان ہو گئی ہے، اور اب وہ یہاں کسی ایک فرقہ کی فقہ نافذ کر دینے سے یہ احساس دلا رہی ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ دوسرے لوگ یہ سمجھ اور سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ معاشی نظام کے ڈھانچے کی جگہ ایک دوسرے نظام کا ڈھانچہ قائم کر دینے سے ملک میں اسلامی نظامِ معیشت رائج ہو جائے گا۔

طلوع اسلام نہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے، اور نہ ہی اُن حضرات کو جو اس تحریک سے وابستہ ہیں یا اس سے متفق، اس التباس میں مبتلا ۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان حضرات سے جو ملک میں مختلف تحریکوں کے داعی ہیں، یہ گزارش کرنا چاہتا ہے کہ وہ موجودہ نظامِ مملکت میں جس قسم کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس کے لئے وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہیں کریں، لیکن اپنی تحریکوں کو اسلامی کہہ کر نہ پکاریں۔ اس لئے کہ اس سے علاوہ دیگر امور، ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوگا کہ جب ان کا نظام ناکام رہے گا ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر وہ نظام جو قرآن کی اساسِ محکم پر استوار نہ ہو، ناکام رہے گا ۔ تو (جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے) دنیا یہ کہے گی کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسان کو کوئی محکم نظام دے سکے۔

باقی رہے وہ گرمجوش حضرات (جو بیشتر نوجوانوں کے طبقہ پر مشتمل ہیں۔ اور) جو ان ہنگامی تحریکوں میں

شامل ہو کر اپنے تند و تیز جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں، وہ ان میں شوق سے شامل ہوں، لیکن یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو مبتلائے فریب نہ کریں کہ وہ تحریک اُس اسلامی نظام کے حصول کیلئے عملی اقدام ہے جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت، جو قلب نگاہ کی تبدیلی کی دعوت ہے، پہلے بھی ملک کی دیگر تحریکات سے الگ اور منفرد دعوت تھی، اور آج بھی اسی طرح الگ اور منفرد دعوت ہے۔ جہاں تک بزمہائے طلوعِ اسلام کے ارکان کا تعلق ہے، دستورِ اساسی کی رُو سے کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا اور طلوعِ اسلام عملی سیاسیات میں حصّہ نہیں لیتا۔ لہٰذا اگر کسی بزم کا کوئی رکن کسی ہنگامی سیاسی تحریک میں حصّہ لینا چاہیے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ بزم کی رکنیت سے مستعفی ہو جائے۔ البتہ ہم ان سے جاتے جاتے اتنا ضرور کہیں گے کہ

اُتر تو سکتے ہو پار لیکن مآل پر بھی نگاہ کر لو
خدا نکردہ سکوتِ ساحل نہ راس آیا تو کیا کرو گے

طلوعِ اسلام کی تحریک، فکری تحریک ہے۔ یہ شروع ہی سے فکری تھی اور جوں جوں ہنگامی تحریکوں کے تجربات سامنے آتے جاتے ہیں، یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔ اس سے ہمارا یہ یقین اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی تحریک حق و صداقت پر مبنی ہے۔ اسے ہنگاموں اور شورشوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ ہمارا مطمحِ نگاہ ان سے کہیں بلند ہے۔

فضا کی پہنائیوں کی تسخیر اپنی تقدیر بن چکی ہے
ہمارا مقصد فقط چمن میں نمائشِ بال و پر نہیں ہے

(٠)

کنونشن کا تحفہ

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، امسال کنونشن کا تحفہ، مفہوم القرآن کی طباعت کی تکمیل ہے۔ گزشتہ تین سال کے صبر آزما اور جگر گداز تعطل کے بعد اس سلسلہ زریں کا تکمیل تک پہنچ جانا، چمن خزاں دیدہ میں بہاروں کا لوٹ آنا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ مفہوم القرآن (اور اس کے ساتھ لغات القرآن) میری قرآنی فکر کا ماحصل ہیں، اور مبدا فیض کی کرم گستری سے انہیں جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس سے یہ توقع بندھتی ہے کہ یہ شمعیں میرے مرنے کے بعد بھی تا دیر روشن رہیں گی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہماری فضا کے مقابلہ میں مغرب کی سرزمین فکرِ قرآنی کی تخم ریزی کے لئے زیادہ سازگار ہے اس لئے میں نے مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل کر رکھا ہے۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اس کی طباعت کا مرحلہ خاصا سامان طلب ہے، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا موقعہ کب آئے۔ بہرحال جو کچھ

میرے امکان میں تھا وہ میں نے کر دیا ہے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔

(۰)

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

آج کی اس محفل میں عزیزانِ من! میری یہ حالت رہی کہ ـــ جگر میں ٹیسیں لب ہنسنے پر مجبور۔ میں چاہتا تھا کہ درد و غم کے جس قطرہ کو میں سینے میں دبائے بیٹھا تھا وہ طوفان بن کر نہ اُمنڈ پڑے۔ لیکن

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

میرے غمخوار رفیقو! آج کی محفل میں میری آنکھیں اُس جان سے بھی زیادہ عزیز، غمگسار دوست کو تلاش کرتی رہیں جس کی تلاش اب میری بقیۃ العمر کی سرگزشت ہوگی۔ آپ پہچان گئے ہوں گے کہ ہمارے قافلۂ بہار کا وہ طائرِ پیش رس کون تھا جو ہم سے یوں بچھڑ گیا ـــ

سمجھنے والے بالآخر سمجھ ہی جائیں گے ہزار اشک پئے کوئی لاکھ چاک سیئے

آہ! عبدالحکیم خان ـــ

تاباں تھیں جن سے غمکدۂ جاں کی وسعتیں
پلکوں پہ وہ چراغ سرِ شام بجھ گئے

ہماری یہ قرآنی محفلیں زندہ و پائندہ رہیں گی ـــ خدا انہیں ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رکھے۔ کہ ان کا مدار شخصیتوں کی طبیعی زندگی پر نہیں۔ لیکن عبدالحکیم خان نے جو نشست خالی کی ہے وہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

فروغِ شمع جو ہے رہیگا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

آیئے ہم اُس رفیقِ محترم کی یاد میں دعا کریں کہ لیلائے قرآنی کے اس مجنوں نے سرحد کے دشت و جبل میں حق کی جو آواز بلند کی تھی وہ ایک قافلۂ نو کے لئے بانگِ رحیل ثابت ہو۔ جن راہوں میں اس نے اپنے آنسو بکھیرے تھے وہ راہیں سدا آباد رہیں۔ اور اس کی پاکیزہ زندگی کی جوئے رواں جنت الفردوس کے چمن زاروں کی شادابیوں میں اضافہ کا موجب بنے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

والسلام

باسمہٖ تعالیٰ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

قوموں کی تعمیر

فکر سے ہوتی ہے نعروں سے نہیں!

پاکستان کی عوامی تحریکوں کا بے لاگ تجزیہ

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!

صدر گرامی قدر و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت!

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبۂ محرکہ جبلی تقاضا (Instinctive urge) ہوتا ہے — اسی کو آگے بڑھ کر انسان کے معاملہ میں 'جذبات' سے تعبیر کیا جاتا ہے — حیوانات کے برعکس' انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کرے۔ اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا' دلائل و براہین کی رُو سے موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر' اسکے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے اور اس طرح' امکان بھر کے تدبر و تفکر کے بعد' نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیشِ نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آجاتی ہے — بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ اس کا غصہ تیز ہو جاتا ہے — اس لئے کہ اس کے پاس' اس کے علاوہ 'مدافعت' کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔

حیوانات کے جبلی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ہوتا ہے — بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی جب تک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو یا اسے بھوک نہ ستاتی ہے' کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقیماندہ چارہ کون کھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی — جو جبلی تقاضوں میں شدید ترین تصور کیا جاتا ہے — فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کے جبلی تقاضوں یعنی جذبات پر فطرت نے اپنا کنٹرول عاید نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عاید کرنا پڑتا ہے اور یہ کنٹرول عقل و فکر کی رُو سے

فطرت کا کنٹرول نہیں

ہی عاید کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا، عقل و فکر اور دانش و بینش باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہرِ انسانیت ہے اور جبلّی تقاضوں (جذبات) کی بیباکی، حیوانیت سے بھی پست سطح زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے، انسان حیوانات کے مقابلہ میں بڑا کمزور واقع ہوا ہے — نہ اسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے نہ عقاب جیسا بلند اُڑ سکتا — لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں "میری اور تیری" کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو اُن لوگوں نے، جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود و فراموش اور اپنے جذبۂ حرصِ زر کو قیود نا آشنا بنانا چاہتے تھے، اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (Exploit) کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج، اور رفتہ رفتہ مصلوب کر دیا جائے — عزیزانِ گرامی قدر

عقول کی جنگ

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں باہمی کشمکش ..... Battle of wits یعنی عقول کی جنگ مسلسل چلی آ رہی ہے۔ حاکم و محکوم، آمر و مامور، مطاع و مطیع، مقتدیٰ و مقتدی، آجر و مستاجر، محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز اسی کشمکش پیہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے اُن لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے، اپنے دامِ تزویر میں لے آئے، اور اس طرح گوشۂ سیاست میں حاکم و آمر، دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدیٰ اور جہانِ معیشت میں ربکم الاعلیٰ اور اَنا ربکم الاعلیٰ بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔ اس نظام

اسے مذہب کہتے ہیں

کو جس کی رُو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گُل کئے جاتے ہیں، مذہب کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سن کر شاید چونک اٹھیں، کیونکہ مذہب کا تصور تو عام طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے — مذہب نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع بنائے، مذہب کہلاتا ہے، خواہ وہ دہریت ہی کا نظام کیوں نہ ہو۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ

سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے

دینِ خداوندی

ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت بھی حاصل کیوں نہ ہو — کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ — یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے نظریۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے — یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد) الٰہانیت (مذہبی اقتدار) اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت — وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ اور اُن برفانی تہوں کو اُٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے جب حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے وہ ایسا انتظام کرے گا کہ اس کی فکری صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر اُن کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔ آپ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔

عقل و فکر کی عظمت

آپ کو اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستحق کون سے لوگ ہیں۔ وہ کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ جو سینے میں دل (سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ یہ لوگ انسان نہیں حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۷/۱۷۹) اسلئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم

ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں کیوں ہوتا۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بیباک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے ہی متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۲) آسمانی انقلاب کے اس پیامبر عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہو گی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

دین میں جبر نہیں

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے تم سے بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جور و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کر کے کسی سے کوئی بات منوائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیر العقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اولین مخاطب جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے تم سے اپنی بات منوا لوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو؟ چنانچہ آپؐ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ ۔ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶) سماعت، بصارت اور فہم و ادراک ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسول اللہ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخاطبین سے کہتے کہ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ۔ میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں تم اگر اسے رد کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رُو سے ایسا کرو۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۃ سبا کی ایک

سوچا کرو

آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے۔ اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۔ آپ اندازہ لگایئے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجاتا ہے ـــ ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اسکے بعد آپؐ ان سے کہتے ہیں کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رُکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رُک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپؐ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶)۔ تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں

آپ کو عزیزانِ گرامی قدر! معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنیئے اور غور سے سنیئے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۔ (۲۵/۷۳) مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے ـــ یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ـــ ہمارے ہاں، ـــ عزیزانِ من! لفظ ایمان کا انگریزی زبان میں ترجمہ (Faith) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (Faith) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اُس اعترافِ حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد عقل و فکر کی رُو سے کیا جائے۔ اسے آپ (Conviction) کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد (Faith) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت By conviction اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ

بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید ۔۔۔ کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

اور حدیث یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف، تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین، درحقیقت، مذہب کے خلاف چیلنج ہے ضمناً اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ میں نے اپنی کتاب کا نام جو (Islam: A Challenge To Religion) رکھا تھا تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی تھا۔

جذبات، عقل اور وحی

قرآن کریم نے جذبات، عقل اور وحی کے تعلقات کو دو آیات میں اپنے مخصوص حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں ہے۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ اور اس کے سننے، دیکھنے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ...... (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے۔ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے اوراق پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ (۴۶/۲۶) جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوامِ مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے جن کے علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی اور قوم شاید ہی اس بلندی تک پہنچ پائی ہو اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی یہ کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جسے اطمینان نصیب ہو۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدارِ خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رُو سے عطا ہوتے ہیں۔

(۵)

دین کا نظام

یہ تھا وہ دین جو خدا نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں حضور نبی اکرمؐ نے ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔ اس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ اور (۴) انسانی عقل و فکر پر وحی کی مستقل اقدار کے علاوہ اور کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو اپنی نشوونما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے، صفحۂ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور کیفیت یہ تھی کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

دین کی جگہ مذہب

یہ نظام تھوڑی دور چلا تھا کہ استحصالی قوتوں (Forces of exploitation) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ پھر سے مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت، عزیزانِ من! اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب و علل کیا تھے۔ یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اگر میں نے اسے اس مقام پر ضمناً چھیڑا تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلتِ وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائینگے۔ (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری تصنیف ــــ سلیم کے نام ــــ میں وہ خط ملاحظہ فرمالیں جس کا عنوان ہے ــــ اسلام آگے کیوں نہ چلا؟ ــــ) بہرحال، سلبِ مذہب کی قوتیں پھر

ابھریں اور دین کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ان کے پیشِ نظر اوّلین مقصد یہ تھا کہ عقل و فکر کی شمعیں گُل کر دی جائیں نہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا؟ یہ پُر تاریخی تفصیل ہے جس میں میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں اشاعرہ اور معتزلہ کی کشمکش کو یوں بیان کر کے آگے بڑھا جاتا ہے گویا وہ دو فرقوں کے عقاید کی آویزش تھی' وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کشمکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے۔ وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پراپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے، عوام اس کے خلاف اُمنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے، یورپ کی اس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہوگا جس میں مذہب اور عقلیت (Rationalism) کی معرکہ آرائیاں انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آجائے۔ مذہب کی عقل پرستی کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو اور فریقِ مقابل کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔ ہماری تاریخ میں بھی' عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گُل کرنے کے لئے اسی قسم کے جھکڑ چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا' اسے تو چھوڑیئے، انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک

تصوف اور عقل

ورق تلف کر دیا گیا۔ جیسے اس بحران میں ذرا کمی ہوئی' تو رہی سہی کسر تصوّف کی برفانی سلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اسی نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رُو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم' قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ قابلِ اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوّف' دونوں نے مل کر علم و عقل کے چراغ گُل کر دیئے اور اس کا نام دین کی خدمت رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں' وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گُل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گُل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں' ان سے یہ چراغ تو گُل ہوتے ہی تھے۔ ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیلِ جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں

پر باقی رہ گیا۔

(۰)

میں ابھی ابھی برادرانِ گرامی قدر! ان معرکہ آرائیوں کا ذکر رہا تھا جو گزشتہ چند صدیوں میں، یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کشمکش میں بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، مذہب، صرف "زعومہ" خدا پرستی "کا نام نہیں۔ مذہب ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم و عقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

عوامی تحریک

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آگیا۔ اس کے اس جدید لبادہ کا نام "عوامی تحریک یا (Mass Movement) ہے۔ جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں، اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ، اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نازی ازم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ عوامی تحریکات، مذہب کے انہی جدید لبادوں کا نام ہے۔ میں سمجھتا ہوں انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ یا شورش یا ہیجان (Agitation) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروانِ انسانیت کا عقل اور وحی کی روشنی میں، آہستہ آہستہ نسیم سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں۔ یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں عام وسائل رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا کا کوئی خصہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے غیر متاثر رہتے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں صدیوں سے مذہب یعنی عقل و فکر کے خلاف جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ "بھک سے اڑنے والا مادہ (Explosive) تھا جسے صرف فتیلہ دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلہ جوالہ بن جاتا۔

ہندی مسلمانوں کی زندگی

آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتدا جنگ بلقان اور طرابلس سے کر کے ۱۹۳۵-۳۶ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، آتشِ سیال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑجاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرریاریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری دنیا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفانِ بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس و خاشاک کی طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی بس بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ بیکراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہانِ پیر کی موت قریب آگئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہ مضطرب بیقرار موجیں باہمدگر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطحِ آب پر ان کا نقشِ قدم تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مذہب پرستی سے اس کی عقل و فکر کی صلاحیتیں شل ہو چکی تھیں۔ اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ مرسید نے — زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا! — تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغِ تہِ داماں بنا دیا۔ اقبال نے جب اس قوم کی ان بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلا تعینِ منزل صحرا نوردیوں پر نگاہ ڈالی

اقبال کا پیغام

تو اس کے دلِ درد مند سے اک ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا

اور قوم کو اس پر متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن قوم جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اسے ایک شاعرِ تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہو گئی ۱۹۳۲ء میں جب اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ

> اگر ان حالات میں ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادثِ زمانہ کے سیلِ بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑے گا۔

اقبالؒ نے کہا کہ ایک طرف سے یہ آواز آتی ہے تو دوسری طرف سے ایک نوجوان انتہائے جوش و خروش میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ

> ان شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے ــــ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت نہیں رہتی وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

ان کے اپنے الفاظ جو میرے خیال میں آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں یہ تھے کہ (Where there is no vision people perish) اقبالؒ کی یہ آواز بظاہر قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقارخانہ میں گم ہو کر رہ گئی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ــــ (No true voice is ever lost) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی ــــ تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے ان ہنگاموں سے دور بیٹھے اسے سنا اور اپنے صدفِ قلب

قائدِ اعظمؒ

میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائداعظم محمد علی جناحؒ — وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ، متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا نشردہ' اور اقبالؒ کی اس مقدس دعا کی حسین آمین تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا
با اضطرابِ موج' سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا جو قرآنی فکر کی روشنی میں' سکوتِ دریا میں بط کی سی خاموشی کے ساتھ' جانبِ ساحل رواں دواں چلی جارہی تھی — مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار — اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے' دس سال کی قلیل ترین مدت میں' ایک قطرۂ خون بہائے بغیر — حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی تک دیئے بغیر — پاکستان جیسی وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا گیا کہ قوموں کی تعمیر' فکر سے ہوتی ہے' ہنگاموں سے نہیں۔ اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن جس طرح یورپ میں' مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد' عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا، بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی' وہ مذہب' جو تحریکِ پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا، پاکستان میں ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا اور اپنے آپ کو اقامتِ دین کے داعی' اور اسلامی نظام کے علمبردار کی حیثیت سے

پاکستان کی عوامی تحریکیں

متعارف کرایا۔ اس تحریک نے اپنے نظریات اور تنظیمی پروگرام کو کس طرح یورپ کی عوامی تحریکوں سے مستعار لیا تھا' اس کا اندازہ خود ان کے اپنے بیانات سے لگ سکتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد اپنی اسٹیٹ قائم کرنا تھا۔ وہ اسٹیٹ کس قسم کی ہوگی اس کے متعلق امیر جماعت اسلامی' مودودی صاحب' اپنی کتاب "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں لکھتے ہیں۔

اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔
یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے

یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتی ہے

ان کی جماعت کے ارکان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ وہ انہیں اطمینان دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

فاشستی تحریکوں کے قدم قدم

جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف تیس لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے سترہ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت تین لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار لاکھ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔

(ترجمان القرآن، بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۸۰)

آپ نے غور فرمایا کہ اس تحریک نے کس طرح اپنے نظریاتی اور تنظیمی پروگرام کو یورپ کی فاشسٹ، نازی اور کمیونسٹ پارٹیوں سے مستعار لیا تھا۔ ان پارٹیوں کی طرح ان کے پیش نظر بھی قوت کے ذریعہ حکومت چھین کر اپنا تسلط قائم کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے کہتے ہیں کہ اسلام اپنے متبعین سے کہتا ہے کہ

تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بیدخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات۔ صفحہ ۲۴۵)

اور چونکہ تم صالحین کی جماعت ہو اس لئے یہی تمہارا فریضہ بھی قرار پاتا ہے۔ وہ اس صالحین کے گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

جب صالحین کا گروہ منظم ہو، اہل ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو، یا کم از کم اس بات کا ظن غالب ہو کہ عملاً جدوجہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی۔

...... تو اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کرکے ملک کے اندر بزورِ شمشیر انقلاب پیدا کریں اور حکومت پر قبضہ کریں۔

(اسلامی ریاست۔ صفحہ ۔ صفحہ ۴۲)

اس کے لئے بھی وہ مثال روس ہی کی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "اسلامی ریاست" کے جدید ایڈیشن (جنوری ۱۹۶۲ء) میں لکھتے ہیں۔

> موجودہ زمانے کا اسٹیٹ حضرت یوسفؑ کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع ہمہ گیر اور منظم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لئے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ (ص۶۱۸)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ طریق کار (Method) سے۔ لیکن اگر پُرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (Substance of Power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام خفیہ ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔ (۷۱۹)

فاشسٹ تحریکوں میں پارٹی لیڈر کے احکام کی اطاعت ڈکٹیٹر کے طور پر کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے لکھا تھا۔

دہی آمریت

> آج آپ کی آنکھوں کے سامنے جرمنی اور اٹلی کی مثالیں موجود ہیں ہٹلر اور مسولینی نے جو عظیم الشان قوت حاصل کی ہے تمام دنیا اسکی معترف ہے۔ مگر کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کامیابی کے کیا اسباب ہیں؟ وہی دو۔ یعنی ایمان اور اطاعت امر۔ نازی اور فاشسٹ جماعتیں ہرگز اتنی طاقتور اور اتنی کامیاب نہ ہو سکتی تھیں اگر وہ اپنے اصولوں پر اتنا پختہ اعتقاد نہ رکھتیں اور اپنے لیڈروں کی اس قدر سختی کے ساتھ مطیع نہ ہوتیں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۳۷ء۔ بحوالہ مولانا مودودی کی تحریک صفحہ ۲۵۹)

مسولینی اور ہٹلر اپنی اطاعت ایک پارٹی لیڈر کی حیثیت سے کراتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے چونکہ اپنی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کیا تھا اس لئے، انہوں نے پارٹی لیڈر کی اطاعت کو "خدا اور رسول" کی اطاعت سے تعبیر کیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامت دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزو ہے

جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے ' دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ (ہدایات۔ ص۳۷)

اور "اللہ اور رسول" کی اطاعت میں عقل و فکر کو قطعاً دخیل نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ وہ اپنی کتاب 'تنقیحات' میں لکھتے ہیں کہ

عقل و فکر کے چراغ گُل کر دو

کسی حکم خداوندی میں چون و چرا کرنے کا تم کو حق نہیں خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آسکے۔ خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے۔۔۔۔

تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم (ان عقائد و احکام کو) اپنی عقل' اپنے علم' اپنے تجربات' یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔

۔۔۔۔۔ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔

(پانچواں ایڈیشن ص۱۵۵)

ظاہر ہے کہ جب پارٹی لیڈر کی اطاعت' خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت کی طرح کی جائے گی' تو جو کچھ خدا اور رسول کے احکام کے متعلق کہا گیا ہے' اس کا بالواسطہ اطلاق' پارٹی لیڈر۔ امیر جماعت کے احکام کی اطاعت پر خود بخود ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ بات کس طرح پھیر پھرا کر وہیں آگئی کہ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے متبعین کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا جائے۔

---(۵)---

یورپ کی ان پارٹیوں کا مسلک یہ تھا کہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے جو حربہ ضروری سمجھا جائے اسے بلا تامل اختیار کر لیا جائے۔ یہی مسلک جماعتِ اسلامی کا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوی دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

نہ صرف جھوٹ بولنا بلکہ ہر ستم کا حربہ اختیار کر لینا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف[1] جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن تھے (وہ اب ان سے الگ ہو چکے ہیں) انہوں نے اپنے اخبار المنیر کی ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

وہی حربے

میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دیگر امور منکرین سنت اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آگیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعت لٹریچر کی ایک اسکیم بتائی اور اس کی تکمیل کے سلسلہ میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب سے کہیں کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی تالیف قلب کر کے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔

آپنے ملاحظہ فرمایا کہ عوامی تحریک جب مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے تو اس کی اصطلاحات بھی کس طرح مذہبی ہو جاتی ہیں۔ نازی اور کمیونسٹ جسے کھلے الفاظ میں "رشوت" کہتے، مودودی صاحب نے اس کے لئے "تالیف قلب" کی اصطلاح استعمال فرمائی۔

فاشسٹوں، نازیوں اور کمیونسٹوں کے نزدیک طاقت حاصل ہونے پر اپنے مخالفین کا صفایا کر دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی مسلک مودودی صاحب کا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رسالہ "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں کہ

مخالفین کو ختم کر دو

جس علاقے میں اسلامی نظام رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائینگے، فرائض و واجبات دینی پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ پھر جو بھی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا (یعنی جس بات کو مودودی صاحب اسلام کہدیں گے، اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ طلوع اسلام) اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (ص ۸۰-۸۱)

یہ تھی وہ جماعت جو ان عزائم کو لے کر نزول فرمائے پاکستان ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہاں عوامی تحریک (Mass Movement) کی بنیاد رکھی۔

---

[1] یہ صاحب اب مرحوم ہو چکے ہیں، اس زمانے میں جماعت اسلامی کی کراچی کی شاخ کے امیر تھے۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لزومات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا طریق ہیں۔ یہ ہمارے پیشِ نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ آپ اسے کامل غور و توجہ سے سماعت فرمائیں گے۔

عوامی تحریک کے عناصرِ ترکیبی

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔ ایسے لوگوں کو مذہبی دیوانے (Religious Fanatics) کہا جاتا ہے۔

(۲) عوامی تحریک میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابنِ آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسوں پھونکا تھا لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (Haves) اور (Have-nots) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (Present) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذباتِ نفرت کو مشتعل کئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں۔ اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔

(۳) اس تحریک کے علمبردار حال کو اس قدر قابلِ نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محرومیوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ ان کے دلوں میں

ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آگیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے، اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا تو وہ دیوانہ وار لپک کر ان کے پیچھے ہو لیں۔

(۴) عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے، مستقبل کے فریب تخیل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اعطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (Followers) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بد دل ہو جاتے ہیں۔

(۵) اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ — وہ آئی، تو وہ آئی' دل ناصبور صبح — ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے انہیں جلدی سے تباہ کر دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (Tempo) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں۔ اس ضمن میں اس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دور رکھا جاتا ہے مگر اسے لمبے فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آسکتا۔

(۶) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے — اس میں کوئی دوسری پارٹی شریک نہیں۔ ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

(۷) عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں

Complexes کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ لوگ اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

(۸) عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فِٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرمس (Thermos) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ۔۔۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔!

(۹) عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لاینفک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں ۔۔۔ کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جاتا ہے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اگر کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہوگا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہوگا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغہ آرائی کا، اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

(۱۰) مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے، ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (Faith) کہتے ہیں (FAITH) کی وضاحت برگساں نے بڑے جامع انداز میں کی ہے جب کہا ہے کہ (Faith) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں۔ (Faith) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔ عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

یہ تو ہے عزیزانِ من! عوامی تحریک (Mass Movement) کے لزوم و خصائص۔

عوامی تحریک کے لیڈر

جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے، اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

(۱) وہ اصول پرستی کی جگہ حکمت عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی جیسا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مصلحت کا تقاضا ہو بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

(۲) اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

(۳) وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو خواہ اس کے لئے اُسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا حسنِ عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

(۴) اس کے لئے ایسا مندی ہونا ضروری ہے کہ وہ خواہ اپنے آپ کو تباہ اور اپنی تحریک کو ختم کر دے لیکن نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے نہ کسی مقام پر (Surrender) کرے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود اور اس طرح اسے (One-man show) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہیں پانے دے گا۔ جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد طبقاتی تفاوت کی شدت احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقہ کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹا دیا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو ابھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے۔ لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ــــ اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں عزیزانِ من! وہ عناصر جن سے ایک عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (Chaos) برپا کیا جائے۔

(۰)

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں مذہب کے نام پر ایک عوامی تحریک کی طرح ڈال دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے غلط نظامِ زندگی اور اربابِ نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے، جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی، اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی ابھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس، اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (Chaos create) کرتے رہے۔

کوئی تعمیری کام نہیں

یہ تحریک بڑھتی تو گئی لیکن جن خوش آئند وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگایا گیا تھا ان کے ایفا ہونے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا کہ اس کے بعد اس کا (Tempo) قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس وجہ سے اسے اپنا رُخ دوسری طرف موڑنا پڑا اور "بحالیٔ جمہوریت" کے نام سے اس میں نیا ایندھن ڈالا گیا اور پھر اس روڈ رولر نے جس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا، جو تباہی مچائی اس کے نشانات اب تک اس ملبے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں جس کے نیچے علم و عقل، ہوش و خرد اور تہذیب و شرافت کی لاشوں کو دبا دیا گیا۔

بحالیٔ جمہوریت

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں اور میری چشمِ تصور کے سامنے بعض پیشانیوں کی وہ خشم آلود شکنیں آ رہی ہیں جو انتہائی غم و غصہ کے عالم میں مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ کیا تمہیں اس کا افسوس ہے کہ وہ غلط نظام کیوں مٹ گیا؟ میں اس سوال کا تفصیلی جواب تو ذرا آگے چل کر دوں گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ میں اس غلط نظام کے مٹنے کا افسوس نہیں کر رہا ـــــ غلط نظام کو تو مٹنا ہی چاہیئے ـــ مجھے افسوس ہے اس غلط طریق کا جو اس غلط نظام کو مٹانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ غلط کو غلط سے مٹایئے تو غلط پھر بھی موجود رہے گا۔ صرف اس کے پیکر میں فرق آ جائے گا۔

بحالیٔ جمہوریت کے اس کہرام کی تان اس پر ٹوٹی کہ "ہمیں ووٹ دو"۔ ظاہر ہے کہ "ہمیں ووٹ دو" ایسا پروگرام نہیں جس سے عوامی تحریک کے جھکڑ کو زیادہ عرصہ تک برقرار رکھا جا سکے۔ ایک زیرک نگاہ نے جس نے

میں سمجھتا ہوں کہ عوامی تحریک کی نفسیات کا زیادہ گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا تھا۔ اس حقیقت کو اسی زمانے میں بھانپ لیا اور "ہمیں ووٹ دو" کی جگہ "ہمیں روٹی دو" کا نعرہ لگا کر اس انداز سے چھیڑا کہ محرومین کے جذبات جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اٹھے۔ اب اس تحریک کو صحیح معنوں میں عوامی بننے کے لئے ٹھیک ٹھیک جذبہ محرکہ مل گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی یہی راگ الاپنا شروع کر دیا لیکن عوامی تحریک میں تو جو پہل کر جائے وہی میری ہوتا ہے۔ اس لئے اب میدان سوشلزم کی معاشی تحریک کے ہاتھ میں ہے۔ باقیوں کے ہاں اپنے ناکام تجارب کی نوحہ گری کے سوا کچھ نہیں جو "سوم" یا زیادہ سے زیادہ "چالیسویں" تک جاری رہ سکتی ہے۔

معاشی تحریک

یہ ہے وہ مقام جہاں کنزیان من اہم اس وقت کھڑے ہیں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی رُو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک ہے اور سیاسی پارٹیاں حکمت فرعونی کی مظہر۔ میری تحریک یکسر فکری ہے اس لئے ہم عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں نے جو کچھ آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے وہ نہ کسی پر تنقید ہے نہ کسی کی تنقیص۔ یہ میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہاں کے حالات کا معروضی (Objective) تجزیہ ہے۔ مجھے دین سے عشق ہے اور پاکستان سے اس لئے محبت کہ یہ سرزمین دین کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ اور اس کے حصول کی جدوجہد میں میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تھا۔ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلاب بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکت پاکستان جو ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے اس کا کیا مقابلہ کر سکیگی۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے ان کے آتش مزاج دوستوں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں گاندھی نے (Quit India) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بیباک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اسکے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

ہماری پوزیشن

ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائیگا۔ اُس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہیگا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اُس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس مفرجی رقصِ آتش پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی۔ لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے!

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (Lawlessness) کی زد میں آرہا ہے۔

اس سے بھی آگے، مجھے ایک اور خطرہ نظر آرہا ہے جس کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس معاشی تحریک میں لوگوں کو جس قدر سنہرے خواب دکھائے جا رہے ہیں، اس سے ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ جونہی ہماری پارٹی برسرِ اقتدار آئی، ہم میں سے ہر ایک کے پاس بنگلہ، موٹر، کارخانہ، سیکڑوں مربعے زمین، چاندی سونے کے ڈھیر لگے ہونگے۔ اور انہی تصورات کی کشش ہے جو انہیں اس تحریک کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ پارٹی برسرِ اقتدار آ بھی گئی تو عوام کے ساتھ کئے گئے اس قسم کے وعدے کبھی پورے نہیں ہو سکینگے۔ ان کا

مایوسی کی سرکشی

تو پورا کرنا کسی کے بس کی بھی بات نہیں ہوگی۔ اُس وقت یہ لوگ مایوس ہو جائینگے، اور جب مایوس (Desperate) ہو جائے تو اس کی تباہ کاریاں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب بلی کسی ایسے کمرے میں گھر جائے جس سے باہر نکلنے کے سب راستے مسدود ہوں تو وہ آنکھیں نوچ لیا کرتی ہے۔ علم النفس کی رُو سے مایوسی (Frustration) کا ردِ عمل شدید قسم کا (Aggression) ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ابلیس کے معنی ہیں مایوسی اور شیطان کے معنی ہیں سرکشی۔ جب ابلیس شیطان بن جاتا ہے تو قرآن اسے عَدُوٌّ مُّبِیْن کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی ننگا یا کھلا ہوا دشمن۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کا احساس میری روح پر کپکپی طاری کر دیتا ہے کہ جب یہ لوگ مایوس ہونگے تو ان کے ہاتھوں یہاں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد دکھلائے!

(۰)

قرآنِ کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ بہرہ مندی قرار دیتا ہے اس کی رُو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو' باطل' فلہذا ابلیسی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا' اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے ـــ وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو۔ اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سیکولر نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ

باطل کے نظام

فرعون تھا۔ دوسرے اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے' ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا۔ اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔ قرآن کی رُو سے دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹا یا نہ جائے۔ لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی

داخلی تبدیلی

پیدا کی جاتی ہے ـــ تبدیلی پیدا کیا کی جاتی ہے؟ قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔ (۱۳/۱۱) جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ایکہ منزل را نمی دانی ز راہ ـــ قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود ـــ ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد انسانی قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ـــ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود ـــ جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقائے جلیل کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا ـــ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (Means are justified by the ends achieved) میکیاولی سیاست کا اصول ہے قرآن کا نہیں۔

قرآن کی رُو سے غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہیئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، حضورؐ نبی اکرم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پرسکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد جب وہ اس کی صداقت کے متعلق دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ۔ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اسکے ساتھ ہی انکی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہے جنکی بنیاد دل پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے اسی سے ابنِ آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اُس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر برضا و رغبت اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔ اور

(۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہ نے فرمائی اور اس طرح انکے قلب و نگاہ میں قرآنی انذار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ ترتیل[1] (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق مانیں تو یہ پروگرام بڑا سست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تئیس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ ترتیل میں صرف ہو گئی اور اس کا ماحصل

---

[1] رسول اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی نو "بے عملی" کا دور کہلائے گی۔

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں چھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی — "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن بھی ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھینی جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا — ایمان — یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اعمالِ صالحہ — قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحبِ اقتدار ہو گئی۔ تو معاشرہ میں نظامِ اسلامی خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ یہ کاروان مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے، نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی — انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں

سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا سب کچھ دیکھ بھال، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا۔ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد اپنے آپ کو اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اسکے اہل بننے میں مصروف رہے جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدرِ اول میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا۔ اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کریں، مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا۔ اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہو گا جو صحیح اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہو۔

(۱)

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے، تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چارہ ہے۔ غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے کی آج ضرورت ہے اور آپ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اُس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے اور نہیں سمجھتے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود ۔۔

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ معاشی مسئلہ کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپِ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمار داروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے ۔۔ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ انکی بھوک کا

مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بویا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بھوک کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار ہا تمناؤں اور آرزوؤں' بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود 'فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالب نے یہ کہا تھا کہ ــ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ــ اُسے اس کا بھی احساس تھا کہ ــ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ــ ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جد و جہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

چین کی مثال

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیسا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

چین کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں انقلابِ چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دینگے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو' اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں

ڈھالنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علی حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآن کا معاشی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قوم کی دولت ابنائے قوم کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے۔ اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے انہیں قانون کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاق حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے، ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اگر پیش نظر مقصد موجودہ نظام میں (جیسا کچھ یہ ہے) اقتدار حاصل کرنا ہے تو اس کے لئے بھی نہایت پُرامن آئینی طریق اختیار کیا جائے۔ ملک میں معاشی تبدیلی کے لئے قانونی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ لیکن اسے اپنے پروگرام کا منتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے محض عارضی تدبیر سمجھا جائے۔ منتہیٰ افراد قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی قرار دی جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرۃ ہے۔ یعنی اس حقیقت پر کامل یقین کہ انسان کا کوئی عمل جتنے کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آجائیں اور خواہ مرنے کے بعد۔ اس ایمان کے بعد قانون کی اطاعت، یا مستقل اقدار کی پابندی نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ!) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں۔ یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کے بعد ہے۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵)۔ اور پھر جو فیصلہ تو دے، اس کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی ہنگامہ خیزی اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا مقصد افراد معاشرہ کی

ایمان بالآخرۃ

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے عزیزانِ من! جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے، تحریکِ پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اور قرآن کریم پر غور و تدبّر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے۔ اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیقِ ایزدی اس بائیس سال کے عرصہ میں، کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر، نہایت خاموشی سے فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یا گوئٹے کے "نغمۂ محمدؐ" میں اُس آسمانی ندی کی طرح جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دوآتشہ کر دیا ہے کہ

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود بیگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا — اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ میں نے قوم سے یہ کہا کہ ہم جس قسم کے مسلمان بھی ہیں، ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس خطۂ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے وہ اصلاحی زندگی کا پیکر بن کر ابھریں۔ اس سلسلہ میں، میں نے، پاکستان میں مروجہ طریق و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی — اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں جذب رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم عزیزانِ من! آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس سال

تعلیمی نظام

سے اپنی درسگاہوں — اسکولوں، کالجوں، مکتبوں، دارالعلوموں — میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی؛ یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے عزیزانِ من! چاروں طرف سے مایوس ہو کر بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور پر تیار نہیں ہوتی تو ہم انفرادی طور پر ایک ایسی درسگاہ قائم کریں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درسگاہ میں تعلیم کا انداز کیا ہوگا، اس کا تصور علامہ اقبالؒ نے نہایت جاذب اور حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ

کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

لیکن —

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

اس درسگاہ میں نصابِ تعلیم تو وہی ہوگا جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء تعلیم کے عام میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے گا کہ طلباء میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کونسی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کون سی ان کے خلاف۔ اور اس کے بعد ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو دنیا کے سامنے علومِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل، اس نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

ہم عزیزانِ من! آجکل اسی درسگاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہیں — کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ — یہی وہ نوجوان ہونگے جو عوامی اور ہنگامی تحریکوں کا خس و خاشاک بننے کے بجائے قرآنی فکری تحریک کا وہ شجرِ طیب بنیں گے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ. اس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھوٹے جھولتی — انہی کے ہاتھوں دین کا نظام بھی قائم ہوگا اور یہی بہی خواہانِ انسانیت روٹی کے مسئلہ کا صحیح حل بھی پیش کر سکیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے سنہ ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ مسولینی نے کہا ہے کہ جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے میں سنے (یعنی علامہ اقبالؒ نے) کہا کہ یوں نہیں' بلکہ یوں کہ جو خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

فکر و نظر کی تبدیلی عزیزانِ من! سیرت و کردار کی پختگی سے انسان کو فولاد بنا دیتی ہے — اور یہ وہ فولاد ہے جسے کبھی زنگ نہیں لگتا۔

اور یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا منتہیٰ ہے۔ والسلام!

بابُ المراسلات

بانیانِ پاکستان کے ارادے

ناظم آباد کراچی سے ایک صاحب کا طویل مکتوب موصول ہوا ہے جسے ہم بجنسہٖ شائع کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"مکرمی! سلام و رحمت

"طلوعِ اسلام" بابت اکتوبر ۱۹۷۵ء کے صفحات ۵۰ تا ۵۴ کے مطالعہ کے بعد میرے (اور شاید میرے ہم خیال بیشمار پاکستانی مسلمانوں کے) ذہن میں ایک بات آتی ہے کہ مودودی صاحب نے ساری عمر میں ایک بات تو ایسی کی جس کی صحت کے شواہد کے لئے کسی وقت نظر کی ضرورت نہیں ہے اور وہ یہ کہ "پاکستان بننے کے بعد ان کے (یعنی قائداعظم یا جملہ بانیانِ پاکستان کے) طرزِ عمل سے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس ملک کو اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے"۔ ایک بدیہی شہادت اس کی یہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی اِن حضرات نے اُس دو قومی نظریہ کو ترک کر دیا جس کی بنا پر پاکستان کے حصول کی جدوجہد کی گئی تھی۔ اور بجائے اسلامی اصول کے مطابق، قومیت کے عصرِ جدید کی سیاست کو اپنا کر جغرافیائی قومیت کو اپنا لیا جس کے نتیجہ میں قومی اسمبلی میں آئین سازی و قوانین سازی کے لئے غیر مسلموں کو بھی (جن کو پاکستان سے پہلے ایک دوسری قوم کے افراد کہا جاتا تھا) وہی حقوق دے دیئے گئے جو مسلمانوں کو تھے۔ اس طرح "شوریٰ بینہم" میں "بینہم" کے مفہوم میں وہ تمام افراد شامل ہو گئے جو اسلام کے مخالف تھے۔ کیا "شاورھم فی الامر" میں "ھُم" کی ضمیر کے معنی یہی ہیں؟ کیا شارع نے اُس اسلامی مملکت کی تشکیل میں (جس کے احیاء کے وعدے ہم سے کئے گئے تھے) مدینہ کی جغرافیائی حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کو اپنی مجلسِ شوریٰ میں اسی طرح شامل کیا تھا؟ اور پھر یہ کہ اس اسلامی مملکت (بزعم بانیانِ پاکستان) کی آئین و قوانین ساز اسمبلی میں نہ صرف غیر مسلموں اور مسلموں کو شوریٰ کے حقوق برابر دیئے گئے بلکہ وزارتِ قانون کا سربراہ بھی ایک غیر مسلم اور اُس قوم کے فرد کو بنایا گیا جس قوم کو ہم اسلام کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے یا کم از کم کہتے رہے تھے۔ وہ روایت آج بھی قائم ہے اور آج بھی یہ وزارت اُسی طرح ایک غیر مسلم کے ماتحت ہے۔ یہ صاحب اسلامی قوانین اور اصولوں کے بہت بڑے مداح ہیں لیکن کوئی معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی یہ بات سمجھ سکتا

ہے کہ کسی طریقۂ حیات کے اصول اور قوانین کی صداقتوں کا قائل ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص اُسے اختیار نہیں کرتا (جس میں کوئی مجبوری بھی نہیں ہے) تو وہ کہاں تک اپنی مدح سرائی میں مخلص ہوگا۔ اور کیا یہ صرف "کرسی" پر قائم رہنے کی خاطر تو نہیں ہے۔

آئین وسازی و قوانین سازی کی اسمبلی تو بڑی چیز ہے۔ اگر وہ حضرات اپنے وعدوں پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی کم از کم اُن صریحی اور بدیہی امور کی طرف تو توجہ کر سکتے تھے جو اسلام کے ہر مدرسۂ فکر کے نزدیک قرآن و "حدیث" کے خلاف تھے۔ مثلاً اگر قمار بازی اور شراب کی خرید و فروخت بند کر دی جاتی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔ بلکہ ریس اور دیگر قسم کی قمار بازیوں کو بند کر کے قومی سرمایہ کو بہتر اور مفید کاموں پر استعمال کرایا جا سکتا تھا اور شراب کی بندش سے لاکھوں روپیہ کا زرمبادلہ بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ دو کام تک بھی اُن حضرات سے نہ ہو سکے جو اسلامی مملکت کے احیاء کے وعدوں سے لوگوں کو فریب دیتے رہے تھے۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ شراب و قمار کی بندش سے اُن حضرات میں سے بیشتر افراد کی اُس تھوڑی سی تفریح پر اثر پڑتا تھا جس کی ضرورت انہیں امور مملکت کی تھکاوٹ کے بعد ہوتی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دو مشاغل کو بند کرنے سے ہمیں ہمارے خداوندانِ نعمت غیر مہذب اور جاہل سمجھ لیتے اور "ترقی" کے لئے جو "امداد" دی جا رہی تھی وہ روک لیتے۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ جن ملکوں میں شراب خانے اور قمار خانے نہیں ہیں ان کی دقعت بھی یورپ اور امریکہ کی نظروں میں محض اس وجہ سے کم نہیں ہے۔ مثلاً سعودی عرب میں اور خلیج فارس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں شراب و قمار ممنوع ہیں مگر اُن ممالک کی دقعت و عزت میں کوئی فرق اس وجہ سے نہیں آیا اور روس و چین سے تو امریکہ اور یورپ والے بھی لرزہ براندام ہیں مگر اُن ممالک میں جوئے خانے اس طرح برسرِ عام نہیں ہیں۔

تو محترم بات وہی ہے جو اب دیگر سیاسی حضرات کہہ رہے ہیں کہ قائداعظم اور ان کے رفقاء کی نیت بیشک پُرخلوص تھی لیکن اُن کا مقصد آخر صرف معاشی اور سیاسی طور پر مسلمانانِ ہند کی اکثریت کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کا تھا صدرِ اول کی اسلامی مملکت کے احیاء کے وعدے محض ترغیب کے لئے کئے گئے تھے جن کے ایفاء کے لئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انہوں نے کوئی ظاہری و باطنی کوشش نہیں کی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اُن بانیانِ پاکستان میں سے زیادہ تر "مسٹر" قسم کے لوگ تو ان وعدوں کو بھول ہی گئے تھے مگر وہ "مولانا و اولنا" حضرات بھی جو تحریکِ پاکستان میں شریک رہے اور جو ان وعدوں کے معانی سمجھتے تھے جو قوم سے کئے جا رہے تھے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد "لما تقولون مالا تفعلون" کو بھول گئے۔ کیا مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا ظفر احمد انصاری و مفتی محمد شفیع جیسے علماء کا یہ ایمانی فریضہ نہیں تھا کہ جب بانیانِ پاکستان نے اپنے وعدوں سے انحراف کیا تو وہ اُس سے اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار کرتے جو ایمان کا آخری درجہ ہے۔ اگر اُس وقت نہیں تو جنوری ۱۹۵۶ء میں جب ۳۱ "علماء اسلام" نے دستور کے بنیادی اصول مرتب فرمائے تھے اس وقت بھی اگر انہیں قرآن و سنت میں کہیں یہ نکتہ نظر نہیں آیا

تھا تو کم از کم مطالبۂ پاکستان کے بنیادی اصول یعنی دو قومی نظریہ کا بھی لحاظ رکھتے اور ایک دفعہ اُن ۲۲ دفعات میں اور شامل کر دیتے۔ لیکن اس کے لئے ایمانی جرأت کی ضرورت ہے جو نہ ۲۳ برس پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

تو بات یہ ہوئی کہ جو لوگ قرونِ اولیٰ کی اسلامی مملکت کے احیاء کی فی الحال خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں ہیں۔ اس کے لئے پاکستان کا ذہن ابھی تیار نہیں ہے۔ پاکستان میں اسلامی اصول صرف اُس وقت صحیح سمجھے جاسکیں گے جب ہمارے ذہنی اور علمی مرشدوں (اقوام یورپ و امریکہ) پر رفتہ رفتہ اِن اصول کی صداقت ثابت ہو جائیگی اور وہ اِس پر عمل پیرا ہوں گے۔ ہم تو صرف اندھی تقلید کے قائل ہیں۔ اگر ہمارے مرشدینِ مغرب کوئی بری بات کرینگے تو ہم اس کی تقلید کرینگے اور اگر وہ کوئی اچھی بات کرینگے تو ہم اس کی تقلید کریں گے۔ ہم میں وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہونے دی جا رہی ہے کہ ہم خود اپنی بصیرت سے کسی چیز کی بنفسہٖ برائی اور اچھائی کو سمجھ کر ترک یا اختیار کر سکیں۔ اگر آپ کی یہ آرزو ہے کہ اسلام کی صداقت اور اس کے عالمگیر اصول کو پاکستانیوں سے عملاً منوالیں تو اس وقت کا انتظار کیجئے جب امریکہ اور یورپ والے اسے مان لیں اور پھر ان کی تقلید میں ہم بھی مان لیں۔ ممکن ہے اس میں دو چار سو برس لگ جائیں جو قوموں کی زندگی میں کوئی لمبا عرصہ نہیں ہے۔ مگر یہی ہوتا ہے کہ ہم کسی اسلامی اصول پر اُسی وقت گامزن ہونگے جب امریکہ اور یورپ اس کی تقلید کرینگے۔

بظاہر آپ مجھے یہ الزام دینگے کہ میں بانیانِ پاکستان کو منافق سمجھتا ہوں۔ مگر محترم! اُن کے اقوال و اعمال کو تضاد کو کیسے چھپایا جائے۔ اُن لوگوں کی نیت کے خلوص میں شک نہیں لیکن ان کا مقصد محض یہی تھا کہ غیر منقسم ہند کی مسلم اکثریت کو سیاسی و معاشی آزادی دلائی جائے اور وہ مقصد حاصل ہو گیا کیونکہ بقول فلسفیانِ مغرب کے "محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے" اسلئے غیر مسلموں سے "جنگ" اور مسلمانوں سے "محبت" میں انہوں نے اُن وعدوں سے بھی کام لیا جس کے ایفاء کے خیال کو بھی پاکستان بننے کے بعد کبھی ذہن میں نہیں لاتا تھا۔ کیا کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ قائداعظم اور قائدِ ملت اور ان کے ذی علم اور ذی ہوش سیاسی اور مذہبی رفقاء یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسلامی مملکت کے کیا معنی ہیں جس کے لئے وہ دس کروڑ مسلمانوں سے وعدہ کر رہے ہیں۔ اور کیا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہی اُن کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ وہ برسوں سے مسلم و غیر مسلم افراد کو دو جداگانہ اقوام کہتے رہے ہیں اور کیا آج بھی ان بانیانِ پاکستان میں سے جو لوگ میدانِ سیاست میں قلابازیاں کھا رہے ہیں وہ کبھی بھول کر بھی ان وعدوں کی اصلیت کا ذکر کرتے ہیں۔

مکرمی! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر مودودی صاحب نے کم از کم اس نکتہ میں صداقت سے کام لیا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعض مصلحت کی بنا پر انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ بات انہیں بعد میں معلوم ہوئی کہ بانیانِ پاکستان نے اپنا ارادہ بدل دیا ورنہ تو بات یہی ہے کہ پاکستان کے لئے ترغیب دلانے والا وعدہ جو وہ لوگ کرتے رہے تھے اُس کے متعلق اُس وقت بھی وہ سمجھتے تھے کہ اِس کا ایفاء ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ ممکن ہے ان کے رفقاء کا مذہبی طبقہ اِس امید پر ساتھ

ہوگیا ہو کہ یہ وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔ لیکن اگر یہ بات ہوتی کہ مذہبی طبقہ بھی فریب خوردہ ہوتا تو وہ پاکستان بننے کے بعد ہی جب انہیں یہ آثار نظر آ رہے تھے کہ ہم سے غلط وعدے کئے اور کرائے گئے تو فوراً احتجاج کرتا مگر بات تو یہ ہے کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری ؎ !

اگر آپ کو میرے خیالات سے اختلاف ہو تو براہِ کرم "طلوعِ اسلام" کے صفحات پر اپنی مدلل تردید شائع فرما دیں تاکہ مجھ جیسے دیگر افراد بھی اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ والسلام! "

طلوعِ اسلام

مودودی صاحب مبہم اصطلاحات استعمال کرنے کے فن کے ماہر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ۲۰ راگست کی تقریر میں "بانیانِ پاکستان" کی اصطلاح استعمال کر کے اس کی، اپنی مصلحت کے مطابق، تشریح کے جملہ حقوق بحق مصنف" محفوظ کر لئے۔ اس کے بعد جب ان پر لے دے ہوئی تو انہوں نے قائداعظمؒ کو اس زمرہ سے نکال دیا۔ اور باقیماندہ حضرات (بانیانِ پاکستان) کی تفصیل پھر مبہم رکھی کہ اس کی مزید تفسیر کا دروازہ کھلا رہے۔ لیکن صاحب مکتوب نے ان میں قائداعظمؒ کو بھی شامل رکھا ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس "بانیانِ پاکستان" یا کسی اور کا وکالت نامہ نہیں جو ان کی مدافعت کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہو۔ ہم ذمہ دار صرف اپنے آپ کے ہیں۔ اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ حق کی آواز کسی طرف سے بھی بلند ہو، اس کی تائید کی جائے اور باطل (قرآن کے خلاف) کی آواز کسی گوشے سے بھی ابھرے اس کی مخالفت کی جائے۔ جہاں تک "بانیانِ پاکستان" کا تعلق ہے، ان میں سے ہم قائداعظمؒ کے متعلق اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک

کہ وہ اس سے بہت دور تھے کہ دل میں کچھ رکھیں اور زبان سے کچھ کہیں۔ ان کی سیرت کا یہ وہ درخشندہ پہلو تھا جس کا اعتراف اور اعلان ان کے دشمنوں تک بھی کرتے تھے۔ اور ہمیں چونکہ انہیں بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب تھی اس لئے اس کی شہادت ہم اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر بھی دے سکتے ہیں۔ یوں بھی آپ غور کیجئے کہ اگر وہ تحریکِ پاکستان کے دوران اسلام کا نام محض مصلحتاً لیتے تھے تو حصولِ پاکستان کے بعد یہ مصلحت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد کی ان کی تحریریں اور تقریریں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے اس نصب العین کو یہاں بھی بار بار دہراتے رہے۔ (ذرا آگے چل کر اس کی شہادت خود مودودی صاحب کی زبان سے آپ کے سامنے آجائے گی)

باقی رہے مودودی صاحب سو آپ ان کی گزشتہ تیس چالیس سال کی تحریریں پڑھئے اور دیکھئے کہ (بانیانِ پاکستان تو ایک طرف رہے) انہوں نے کسی کو بخشا بھی ہے؟ انہیں اپنے سوا دنیا میں کوئی شخص صاحب کردار دکھائی

ہی نہیں دیتا ـــــ نہ ماضی میں نہ حال میں ـــــ وہ اپنے ہم نواؤں کی کسی حد تک ضرور تعریف کرتے ہیں لیکن وہ بھی اس وقت تک جب تک وہ ان کا حاشیہ نشین رہے۔ جونہی اس نے ان سے اختلاف کیا' انہوں نے اس کی سیرت و کردار میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ہم ذاتیات میں نہیں الجھا کرتے ورنہ ہم اس باب میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں کہ خود ان کی گفتار اور کردار میں کس قدر تفاوت ہے۔ ہم صرف ان دو چار مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ جو ان کے اپنے حلقہ سے باہر آ چکی ہیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ جو اس طمطراق سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ زبانیانِ پاکستان، زبان سے کچھ اور کہتے ہیں اور ارادے ان کے کچھ اور رکھتے' اس باب میں خود ان کے اپنے کردار کی حالت کیا ہے۔

مودودی صاحب کا کردار

(۱) مودودی صاحب نے جب غلافِ کعبہ کے جلوس نکالے ہیں' تو اس پر لائل پور کے حکیم عبدالرشید اشرف صاحب نے اپنے جریدہ المنبر کا غلافِ کعبہ نمبر شائع کیا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس ڈرامے کے پس پردہ کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا ـــ واضح رہے کہ اشرف صاحب کسی زمانے میں جماعتِ اسلامی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے اس پرچہ میں ایک اور واقعہ بھی لکھا تھا جسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

"۱۹۵۶ء میں مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس کے دوران مولانا مودودی صاحب سے انتہائی عقیدت و محبت رکھنے والے ایک عظیم ترکنِ مجلسِ شوریٰ نے (عظیم تر اس لئے کہ وہ مولانا کے نزدیک بھی بے حد قابلِ اعتماد رہے اور جماعتی مناصب و معاملات میں بھی انہیں آخری درجے کے مواقع سالہا سال تک میسر رہے ہیں) سخت اضطراب کی حالت میں یہ بیان کیا کہ امیر جماعت سے میری عقیدت کا شیشہ اس وقت چکنا چور ہوا جب مولانا نے ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ

"میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اسے گوارا کرنا پڑا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق ایسا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آ گئے ہوں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہاروں کو میں انہیں قبول نہیں کرتا، یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاسنامہ نہ صرف تیار کر رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرا لیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ۔"

ان محترم رکن مجلس شوریٰ نے کہہ سے تاثر سے فرمایا کہ مولانا کی یہ بات صراحتہً خلاف واقعہ ہے۔ اور تو اور ہمارے اپنے ہاں کا واقعہ ہے کہ ہم نے . . . . . سے بتوسط . . . . . سپاسنامہ مرکز میں بھجوایا اور یہاں سے ترمیمات کے ساتھ واپس آگیا۔ مولانا جب ہمارے ہاں تشریف لائے تو یہی سپاس نامہ ان کی خدمت میں مع تصلی کے پیش کیا گیا۔ مولانا کا یہ جواب کیا صریح طور پر . . . . . کی تعریف میں نہیں آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا اقامت دین ہم سے ہو سکے گی جو مولانا کے زیر قیادت اس کا علم العلی لئے پھرتے ہیں . . .

(۲) مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۵۱ء میں بالتصریح لکھا تھا کہ تصویر اتروانا حرام ہے۔ اس کے باوجود ان کی اپنی تصاویر آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے ان سے سوال کیا کہ آپ اخباری نمائندوں کو منع کیوں نہیں کرتے کہ وہ آپ کا فوٹو نہ اتاریں۔ اس پر مودودی صاحب نے فرمایا۔

بار بار منع کر چکا ہوں لیکن ایک شخص کو اچانک شوٹ کر لیا جائے اور کیمرہ بندوق کی طرح کام کر جائے تو اس میں مقتول کا کیا قصور ہے۔

مستفسر نے کہا کہ جس وقت وہ فوٹو لینے لگیں آپ اسی وقت منع کر دیا کریں۔

اس پر مودودی صاحب نے فرمایا۔

جب ایک آدمی حرام کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو اسے اگر روکا جائے اور وہ نہ رکے تو وہ شدید گنہگار ہوگا۔ مجھے چونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس وقت نہیں رکیں گے اس لئے اس موقع پر منع نہیں کرتا۔ ویسے اس معاملہ میں اسلام کے احکامات سے کون سا اخباری نمائندہ یا فوٹوگرافر بے خبر ہے۔ (آئین - لاہور - ۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء)

گفتار آپ نے سن لی - اب کردار کی طرف آئیے۔ المنبر نے اپنی ۷-۱۳ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد کو مخاطب کرتے ہوئے سوالات کی شکل میں حسب ذیل انکشافات کئے تھے۔

(۱) آپ مرکزی جماعت سے معلوم کیجئے کہ کیا کبھی کراچی سے کوئی انگریزی ہفت روزہ جمعیت طلباء کے کارکنوں کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ اس پر مرکزی بیت المال کے دس ہزار روپے صرف ہوئے تھے اور اس میں "غیر اسلامی تصاویر" شائع ہوا کرتی تھیں۔

(۲) کیا کبھی جماعت کے عظیم تر رہنما نے یہ تجویز مرکزی شوریٰ میں رکھی تھی کہ پاکستان کے فلاں حکمران کے دورہ امریکہ کی تصاویر کا البم جماعت اسلامی اپنے اہتمام سے شائع کرے اور اسے انتخابی مہم میں استعمال کرے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح امان اللہ خان مرحوم والئی افغانستان ادوان کی ملکہ کے

دورہ کی تصاویر بچو سقہ کے انقلاب کے وقت شائع کی گئی تھیں۔)

(۲) کیا یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی کے صف اول کے راہنماؤں کے نیم جماعتی اور ذاتی مجلات و اخبارات میں غیر اسلامی تصاویر شائع ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اور

(۳) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض کارکنوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے بعض دوروں کی تصاویر کے البم بنائے ہوں اور ان البموں کی تفصیلات مرکزی مجلس شوریٰ میں زیر بحث آئی ہوں۔ اور اس کے باوجود جماعت اسلامی کے مرکز یا امیر نے ان کارکنوں کو اس فعل سے نہ روکا ہو۔

(۳)۔ اسی اخبار کی ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں یہ واقعہ بھی شائع ہوا تھا۔

۱۹۶۶ء کی معرکۃ الآراء شوریٰ جماعت اسلامی جس میں جائزہ کمیٹی کی "رپورٹ" زیر بحث آئی۔ اس رپورٹ میں متعدد ارکانِ جماعت کی جانب سے یہ الزام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر لگایا گیا تھا کہ مولانا مودودی نے تحریک اسلامی کے محرکِ اول اور جماعتِ اسلامی کے بانی و امیر کی حیثیت سے یہ تصور پیش کیا تھا کہ موجودہ تعلیم گاہیں "قتل گاہیں" ہیں، اس لئے ان میں اپنے بچوں کو داخل کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے — چنانچہ مولانا کی اس زوردار تنقید سے متأثر ہو کر جماعتِ اسلامی کے متعدد کارکنوں اور ارکان نے اپنی اولاد کو مروجہ تعلیم سے محروم رکھا۔ اور ان میں سے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کی اولاد کا اس تعلیم سے محروم رہ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اپنی برادری میں "نکو" بنا دیں اور ان کے رشتوں ناطوں تک کا معاملہ مخدوش ہو کر رہ جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس تنقید اور مسلمانوں کو موجودہ تعلیم گاہوں سے اپنی اولادوں کو اٹھا لینے کی دعوت کے بعد خود امیرِ جماعت نے اپنے لڑکوں کو انہی کالجوں میں داخل کرایا — یہی اقدام ناقابلِ تصور تھا۔ مگر جب ارکانِ جماعت نے یہ سنا کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنی بچیوں کو بھی کالجوں میں داخل کرا دیا ہے تو ارکانِ جماعت کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ اگر خود داعی ہی اپنی دعوت کے پرخچے اڑانے لگے تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔

جب یہ سوال مرکزی شوریٰ کے زیر بحث آیا اور ارکانِ شوریٰ اس پر اظہار رائے کر چکے، تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس الزام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

کہ — "میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک ظالم باپ بننے اور ایک داعی کی حیثیت سے اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھنے کا، اور دوسرا راستہ زیورِ تعلیم سے اپنی اولاد کو آراستہ کرنے کا۔

اگر میں اپنی اولاد کو تعلیم سے محروم رکھتا تو خود میری اولاد مجھے "ظالم باپ" کہتی۔ اس صورت میں میں بعض لوگوں کے تصور کے مطابق داعی کی حیثیت سے اپنی بات پر عمل پیرا تو ہو جاتا مگر "ظالم باپ" ضرور بنتا۔ اور اپنی اولاد کو پست معیار اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتا اور جہاں تک بس چلتا اس کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرتا۔ سو میں نے اسی کو ترجیح دی"۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے اس جواب کا ردِّ عمل شوریٰ میں کیا ہوا؟ یہاں اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ایسے کارکن جو دوسروں کے تنکوں پر بحث ہی نہیں کرتے، ان پر تیر بھی برساتے ہیں، وہ اپنے شہتیروں کو کیوں نظر انداز کئے ہوئے ہیں؟ کیا وہ مولانا مودودی صاحب کے اس "اسوہ" سے بےخبر ہیں؟

(۲)۔ ماہنامہ میثاق لاہور کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء میں حسب ذیل واقعہ مرقوم تھا۔ واضح رہے کہ یہ مجلہ (مولانا) امین احسن اصلاحی صاحب کی زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے جو کسی زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست اور ان کی عدم موجودگی میں جماعت کے امیر ہوتے تھے۔ تحریر تھا۔

مجلسِ شوریٰ کے بزرگ ترین رکن کا ایک بیان ہے جس سے مودودی صاحب کے قائم کردہ نظریہ حکمتِ عملی کی حقیقت پر بڑی اچھی روشنی پڑ سکتی ہے کہ جب ملک میں مرزائیوں کے خلاف تحریکِ ختمِ نبوت کا آغاز ہوا تو جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس تحریک میں عملاً کوئی حصہ نہ لے۔ لیکن جب جماعت کے حلقہ جاتی امراء کا اجتماع منعقد ہوا تو جماعت کے امیر جناب مودودی صاحب نے ان کو ہدایات دیں کہ اب جتنی بھی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے بھڑکاؤ۔ اس پر ان بزرگ رکن شوریٰ نے اعتراض کیا کہ یہ ہدایات مجلسِ شوریٰ کے فیصلے کے قطعی خلاف ہیں، تو انہیں حکماً خاموش کر دیا گیا۔ اور پھر جب تحقیقاتی عدالت کے سامنے مودودی صاحب نے اپنا بیان دیا تو اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ جماعت نے عملاً اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ ہے نظریہ حکمتِ عملی کی ایک عملی مثال۔ جس کے شاہد ایک سابق بزرگ ترین رکنِ شوریٰ ہیں۔

"پاسبانِ پاکستان" تو اس لئے اسلامی نظام قائم نہ کر سکے کہ وہ کہتے کچھ تھے اور نیتیں ان کی کچھ اور تھیں۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جس شخص کا کردار یہ ہو (جس کی چند ایک جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں) کیا وہ اسلامی نظام قائم کر سکتا ہے؟ جہاز تو لوٹنے چلنی کیا پوسے؟

اور لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھتے جائیے کہ مودودی صاحب کو "اولادوں" کا نکتہ کب اور کیوں یاد آیا۔ انہوں

نے مارچ ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا کہ مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ان کا مقصد پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ آپ نے خود اس کا اقرار کیا ہے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان ریزولیوشن (مارچ ۱۹۴۰ء) کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہوگا! اس پر انہوں نے کھسیانے ہو کر فرمایا کہ ہاں! ان لوگوں نے ایسا کہا تو تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد نظر آیا کہ ان کا ارادہ اسلامی نظام قائم کرنے کا نہیں تھا۔

دُوسرا اعتراض

صاحبِ مکتوب نے کہا ہے کہ

اگر وہ حضرات (بانیانِ پاکستان قائداعظمؒ سمیت) اپنے وعدوں پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی شراب اور قمار کو بند کر دیتے۔

جذبات میں بہہ کر انسان کس طرح حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے اس کی شہادت اِس اعتراض سے بخوبی مل سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منکرات (شراب جوا وغیرہ) کا روکنا اسلامی حکومت کا فریضہ ہوتا ہے لیکن ذرا سوچئے کہ یہاں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوری بعد حالات کیا تھے۔ اس وقت ایک نوزائیدہ مملکت اس طرح وجود میں آئی تھی کہ اس کے حصہ کا نقد سرمایہ بتمام ہندوستان کے قبضہ میں تھا — حکومتِ پاکستان کے پاس تنخواہیں دینے تک کے لئے بھی روپیہ نہیں تھا۔ فوج اور اسلحہ بھی ہنوز ناتقسیم شدہ بھارت کی تحویل میں تھا۔ باؤنڈری کمیشن کے غیر متوقع فیصلے نے عجیب پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ جوناگڑھ حیدرآباد وغیرہ پر ہندوستان پولیس ایکشن کے ذریعے ناجائز قبضہ کر چکا تھا۔ کشمیر میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اور ہندوستان میں سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پناہ گزیں کارواں در کارواں پاکستان کی طرف دھکیلے جا رہے تھے — خانماں خراب۔ تباہ حال۔ ستم رسیدہ، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ جیب میں ایک پیسہ۔ بھوکے، ننگے، زخمی — دن رات رواں دواں، روتے کراہتے چلے آ رہے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں رکھا کہاں جائے اور سنبھالا کیسے جائے۔ اِدھر یہ حالت، اُدھر ہندوستان اندر ہی اندر اس قسم کی تجویزیں کر رہا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے — آپ سوچئے کہ کیا ان حالات میں پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظمؒ کو اتنی فرصت تھی کہ یہاں شراب خانے اور قمار خانے بند کرانے کے اقدامات کرتا؟ کیا اس وقت سب سے مقدم مسئلہ پاکستان کی حفاظت اور لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کو سنبھالنے کا تھا یا اصلاحی اقدامات کا؟ اگر اس وقت ملک کی حفاظت اور مہاجرین کی آبادکاری جیسے اہم ترین بنیادی مسائل کی طرف پوری پوری توجہ نہ دی جاتی، تو آج نہ ہمارے مکتوب نگار کراچی کے ایک محلے میں محفوظ بیٹھے اس قسم کے خطوط لکھ سکتے اور نہ ہی ہم لاہور کے ایک مامون و مصئون گوشے میں اس کا جواب — جماعتِ اسلامی نے اپنے تباہ کن پراپیگنڈے

سے ملک میں اس قدر نفرت کی فضا پیدا کر رکھی ہے کہ بجائے اس کے کہ آج ہم شکر گذار ہوں کہ قائداعظمؒ نے ایسے نازک اور پُرخطر حالات میں اپنی جان دے کر ہماری حفاظت کا سامان پیدا کر دیا، ہم اُلٹے انہیں (معاذ اللہ) منافق اور بد دیانت قرار دیتے ہیں ـــــ ایسی احسان فراموش قوم بھی دنیا نے کہیں نہیں دیکھی ہو گی ـــ ہمارے محترم! حالات کے پیشِ نظر تقدم و تأخر کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ خود حضورؐ نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں خمر، میسرہ اور زنا جیسے منکرات کی ممانعت کے احکام، مکی تیرہ سالہ زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں جا کر نازل ہوئے تھے۔ اگر جماعتِ اسلامی یا اس کے پراپیگنڈہ سے متأثر حضرات وہاں ہوتے تو یقیناً خدا پر بھی (نعوذ باللہ) اعتراض کر دیتے کہ اس نے سلسلۂ وحی کے آغاز کے فوری بعد شراب، جوا وغیرہ بند کرنے کے احکامات کیوں نہ نازل کئے!

اب رہا ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ ـــ سو بیشک بعد کی حکومتیں مجرم ہیں کہ انہوں نے اس باب میں بڑا تساہل برتا۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب جو (ان کے بیان کے مطابق) یہاں آئے ہی اس لئے تھے کہ پیدائشی مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کو اسلام کی طرف لے آیا جائے وہ اس تمام بیس بائیس سال کے عرصہ میں کیا کرتے رہے! انہوں نے عائلی قوانین کے خلاف ملک گیر مہم چلائی۔ انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ایسے ایسے محاذ قائم کئے گویا اسلام کی بقا کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی اُس صدارت کے لئے جسے وہ شرعاً قطعی طور پر ناجائز قرار دے چکے تھے، "جہادِ عظیم" کہا۔ انہوں نے انتخابات جیتنے کے لئے لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ کر دیئے ـــ حالانکہ وہ کسی شخص کے بطور امیدوار کھڑے ہونے کو یکسر خلافِ اسلام قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے (بزعمِ خویش) بحالیٔ جمہوریت کے لئے مسلسل خلفشار پیدا کیا ـــ انہوں نے یہ سب کچھ کیا، لیکن یہ فرمائیے کہ انہوں نے شراب خانے، قمار خانے، رقص، زناکاری، وغیرہ بند کرانے کے لئے ایک انگلی تک بھی اٹھائی؟ "بانیانِ پاکستان" تو گردن زدنی ٹھہرے کہ ان کا ارادہ ہی یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کا نہیں تھا، اور اربابِ حکومت (بقول ان حضرات کے) نُخشِ کار تھے، اس لئے وہ ان فحاشیوں کو کیوں روکتے۔ لیکن ان صالحین کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی ایک عملی قدم بھی نہ اٹھایا۔

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی، لیکن
بہ فیضِ بادِ صبا بھی تو گل کہیں نہ کھلے

(۰)

اب ہم اس آخری اور سب سے محکم، دلیل کی طرف آتے ہیں جو اس دعوے کے ثبوت میں دی گئی ہے کہ

دو قومی نظریہ

"بانیانِ پاکستان" کا ارادہ ہی نہیں تھا کہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے اور وہ دلیل یہ ہے کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو تج کیا۔

اگر صاحب مکتوب طلوع اسلام کا مطالعہ باقاعدہ کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ طلوع اسلام مسلسل بائیس سال سے پکار رہا ہے کہ اگر ہم نے اپنے آئین کی بنیاد دو قومی نظریہ پر نہ رکھی تو نہ صرف یہ کہ یہ مملکت کبھی اسلامی نہیں بن سکے گی بلکہ خود وہ بنیاد ہی ختم ہو جائے گی جس پر مطالبہ اور اس کے نتیجہ میں تشکیلِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ دو قومی نظریہ ہی ہمارے ہندوستان سے علیحدہ ہونے کی بنیاد تھا۔ اور اگر یہ بنیاد باقی نہ رہی تو پاکستان کے ایک جداگانہ مملکت رہنے کا جواز بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس باب میں موردِ الزام کون ہے؟

جہاں تک قائداعظمؒ کا تعلق ہے ان کی برئیت کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس باب میں ان کے سب سے بڑے مخالف ــ مودودی صاحب ــ نے ان کی برئیت کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔ قائداعظمؒ نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلسِ دستور ساز پاکستان میں جو تقریر کی تھی اس سے بعض گوشوں کی طرف سے یہ شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس سے دو قومی نظریہ کا ابطال ہوتا ہے۔ یہ سوال منیر انکوائری کمیٹی میں بھی اٹھایا گیا تھا جس کے جواب میں مودودی صاحب نے اپنا ایک بیان کمیٹی کو بھیجا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا۔

> قائداعظمؒ کی اس تقریر کے الفاظ خواہ بظاہر پہلے اور دوسرے مفہوم کے حامل ہیں مگر ہمارے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا منشا بھی حقیقت میں وہی تھا جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے اور انہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہونگے جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی۔ نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہی دن یکایک اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہونگے جو انہوں نے بارہا صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کئے تھے اور جن کے اعتماد ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔ پھر ہمارے لئے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائداعظمؒ ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ ۱۱ اگست کو ایک اعلان کریں اور پھر اس کے بعد بار بار اس کے بالکل خلاف باتوں کا مسلمان پبلک کو یقین دلاتے رہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک انکی مذکورہ بالا تقریر کو ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت

اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انہوں نے اس سے پہلے فرمائیں، اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

سب کو معلوم ہے کہ قائداعظمؒ کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریئے کی بنیاد پر۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک تحریر کا اقتباس میں یہاں نقل کروں گا جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قائداعظمؒ کی چٹھی کا اقتباس دیا تھا اور پھر لکھا تھا۔

اب کیا ہم یہ باور کر لیں کہ ۱۴ اگست کو یک لخت وہ تمام خصوصیتیں مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھیں اور یکایک ایک ایسی نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائداعظمؒ کو اس الزام سے نہیں بچایا جا سکتا کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بناتے اور بدلتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لئے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ ایشیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۰ء)

ضمناً مودودی صاحب نے اپنے اس بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ

بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قائداعظمؒ مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کا وعدہ کرتے رہے تھے۔ اور اس کے بعد بھی وہ اس وعدے کو دہراتے رہے۔

مودودی صاحب کی شہادت سے اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ حصولِ پاکستان کے بعد (کم از کم) قائداعظمؒ نے نہ تو دو قومی نظریہ کو تیاگ دیا تھا اور نہ ہی وہ اس مملکت میں اسلامی نظام قائم کرنے کے وعدے سے پھر گئے تھے۔ ان کے بعد اس معاملہ کو آئینِ پاکستان میں واضح کیا جانا تھا لیکن ۱۹۵۶ء کے آئین اور ۱۹۶۲ء کے آئین دونوں میں اس نظریہ کے خلاف پاکستان میں بسنے والے تمام افراد (مسلم و غیر مسلم) کو ایک قوم قرار دیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے اس پر سخت احتجاج کیا، لیکن جماعتِ اسلامی نے ۱۹۵۶ء کے آئین کا استقبال کس طرح سے کیا اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ان کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس آئین کو ضروری ترمیمات کے ساتھ اپنا لیا جائے کیونکہ وہ اسلام کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ حتیٰ کہ اس جماعت نے جو اپنا

انتخابی منشور شائع کیا ہے اس میں بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ جماعت اسلامی اپنے امیر (مودودی صاحب) کا سب سے بڑا اسلامی کارنامہ یہ گنایا کرتی ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کے حق میں بہت کچھ لکھا تھا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے وہاں یہ کچھ کیا تھا اور دو قومی نظریہ کو کفر اور اسلام میں حد فاصل قرار دیا تھا۔ (تفصیل ان امور کی طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۰ء کے لمعات میں ملاحظہ فرمائیے)۔ انہوں نے مسلم و غیر مسلم کے اختلاط سے جمہوری حکومت کو "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" قرار دیا تھا اور یہی تھی وہ "کافرانہ حکومت" جسے اسلامی بنانے کے لئے وہ پاکستان تشریف لائے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد وہ خود متحدہ قومیت کے اس قدر حامی ہو گئے کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے بعد انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہو گی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (طلوع اسلام۔ جولائی ۱۹۶۴ء۔ صفحہ ۲۲)

اور ان کے حالیہ منشور کے سلسلہ میں جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے تو یہ کہا کرتے تھے کہ "اسلامی حکومت کی پارلیمان میں غیر مسلموں (اہل ذمہ) کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ہو گا" اور اب آپ انہیں برابر کا حق دیتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

> یہ دراصل ایسے ذمی نہیں ہیں جیسے ابتدائے اسلام میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی وہ غیر مسلم جو جنگ سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کی حکمرانی قبول کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک سیاسی نظام کے تحت ذمی ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر وہ قومی اسمبلی میں آتے ہیں تو ہمیں یہ صورت حال قبول کرنی پڑے گی۔

(جماعت اسلامی کے منشور پر تبصرہ مطبوعہ طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۷۰ء)

باقی رہے ۳۱ علماء کے بائیس اصول (جن کا ذکر مکتوب میں کیا گیا ہے) سو اس کے آج بھی سب سے زبردست حامی مودودی صاحب ہیں جو بار بار کہتے ہیں کہ آئندہ آئین ان نکات کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے گا۔

آخر میں ہم دہرا دیں کہ ملک میں جو علماء ایسے تھے یا اب ہیں جو نظریہ پاکستان (دو قومی نظریہ) یا ملک میں صحیح اسلامی (قرآنی) نظام کے خلاف ہیں یا ان کے راستے میں کسی قسم کی بھی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان دونوں کے بدترین مجرم ہیں اور ان کا مواخذہ نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مواخذے سے اس شخص اور اس جماعت کو کیوں مستثنےٰ قرار دیا جاتا ہے جو ان ہر دو امور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ۔۔۔ کیا محض اس لئے کہ ان کے قبضہ میں پروپیگنڈا کی زبردست مشینری ہے؟

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت ماہ اگست ۱۹۷۰ء)

حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے:

فہرست "الف"

۱- محترم محمد رفیق لون صاحب	دہران	روپے ۲۵۰۰/-

فہرست "ب"

۱- محترم صلاح الدین صاحب	چک ۵۰ ٹی ڈی اے بی	۱۰/-
۲- " عبدالواحد صاحب	"	۱۰/-
۳- " خواجہ سمیع الحق صاحب	نوشہرہ	۵۰/-
۴- " خان بخت جمال خان صاحب	مردان	۱۰/-
۵- " خالد صاحب	ابوظہبی	۵۰/-
۶- " عبدالقادر مظفر صاحب	لاہور	۱۰۰/-
۷- " محمد اسمٰعیل صاحب	مری	۳/-
۸- " چوہدری عبدالغنی صاحب	گجرات	۷/-
۹- " چوہدری محمد حسین صاحب	"	۱۰۰/-
۱۰- " مرزا محمد یوسف صاحب	دیوبند منڈی	۲/-
۱۱- " علی اکبر شاہ صاحب	"	۵/-
۱۲- " سردار خان صاحب	"	۵/-
۱۳- " محمد صدیق صاحب	"	۱۰/-
۱۴- " ثناء اللہ قریشی صاحب	اسلام آباد	۲۰/-
۱۵- محترم محمد حسین جعفری صاحب	سیالکوٹ	۱۰۰/-
۱۶- " اکبر علی صاحب	گلاسگو	۹۵/۶۰
۱۷- " عبدالعزیز صاحب	"	۹۵/۶۰
۱۸- " حاجی امین حسین صاحب	"	۹۵/۶۰
۱۹- " غلام رسول صاحب	"	۱۹/۱۲
۲۰- " غلام رسول صاحب (جیزلی سٹور)	"	۹۵/۶۰
۲۱- محترمہ فضیلت رفیق صاحبہ	دہران	۱۵۳/۳۰
۲۲- محترم عبدالحمید صاحب	مانچسٹر ۱۹	۹۵/۵۰
۲۳- " سرور خان صاحب	" ۱۲	۳۸/۲۰
۲۴- " صوبان علی خان صاحب	" ۱۹	۱۹/۱۰
۲۵- " عبدالرشید گوندل صاحب	"	۱۹/۱۰
۲۶- " ایم اے حفیظ صاحب	" ۱۹	۱۹/۱۰
۲۷- " محمد اقبال بٹ صاحب	" ۱۹	۹/۵۵
۲۸- " محمد صابر صاحب	" ۱۹	۱۹/۱۰
۲۹- " ایم - اے جاوید صاحب	" ۱۹	۱۹/۱۰
۳۰- " اعجاز صاحب	" ۱۹	۹۵/۵۰
۳۱- " سید عالم صاحب	"	۱۹/۱۰

		روپے
۳۲۔ محترم محمد خان صاحب۔	مانچسٹر ۱۲	۱۹/۱۰
۳۳۔ " بشیر احمد صاحب۔	" ۱۲	۱۹/۱۰
۳۴۔ " نذیر احمد صاحب۔	" ۱۲	۱۹/۱۰
۳۵۔ " ابرار حسین صاحب	" ۱۲	۱۹/۱۰
۳۶۔ " عمر حیات و محمد یوسف صاحبان۔	انگلینڈ	۴۲/۳۸
۳۷۔ " اشتیاق احمد صاحب	لندن	۴۲/۳۸
۳۸۔ " رحمت علی صاحب	بریڈفورڈ	۴۲/۳۸
۳۹۔ " محمد حسین صاحب	ڈیوزبری	۴۲/۳۸
۴۰۔ " محمد اسلم صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۱۔ " محمد اقبال صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۲۔ " محمد مجاہد صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۳۔ " سلیم اختر صاحب	مانچسٹر ۱۲	۴۲/۳۸
۴۴۔ " راجہ محمد نواز صاحب۔	برمنگھم ۲۹	۱۰۵/۹۵
۴۵۔ محترم محمد علیم صاحب	برمنگھم ۸	۴۲/۳۸
۴۶۔ " نذیر احمد صاحب	"	۴۲/۳۸
۴۷۔ " عبدالخالق صاحب	" ۷	۲۱/۱۹
۴۸۔ " محمد رفیق صاحب	" ۱۲	۲۱/۱۹
۴۹۔ " خالد محمود صاحب	" ۷	۴۲/۳۸
۵۰۔ " محمد ایوب صاحب	" ۷	۴۲/۳۸
۵۱۔ " ضلع ساہیوال کے ایک عزیز دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے		۱۰۰/-
۵۲۔ " محمد امین الحق صاحب	ڈھاکہ	۱۰/-
۵۳۔ " سیف الاسلام صاحب	"	۲۵/-
۵۴۔ " محمد سلیمان صاحب	رنگون	۵۰/-
۵۵۔ " محمد اکرم راٹھور صاحب	ڈھاکہ	۱۵/-
۵۶۔ " کرم الٰہی صاحب ڈھاک سیٹھی (جہلم)		۵/-

نوٹ:۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(K) ۶۵ مورخہ ۴ اگست ۱۹۶۵ء مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۶۵ء کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵-۱۵ کے ماتحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

عطیات "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ" ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور کے نام بھیجے جائیں۔

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ۔ لاہور

جہانِ نو

وہ کتابچہ جس میں طلوع اسلام کے شائع کردہ انقلاب آفرین لٹریچر کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے

ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

اس قسم کا لٹریچر آپ کو اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ ناظم

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

(۱) قرآن کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کرکے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوش قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

(۲) حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں آئی ہیں ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) جو حکومت، قرآن کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یا اسلامی مملکت کہا جا سکے گا۔

(۴) اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی — خوراک، مکان، لباس، علاج، وغیرہ — بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کا عمل)، تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھا جانا۔) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کے بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

(۶) اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

(۷) طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امّت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملّت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

(۸) اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے۔

(ناظم)